جب گِدھ لوٹ آئے
شفیق مسعود
ترتیب
لیاقت جعفری
عمر فرحت

پیشِ نظر کتاب ہمارے واٹس ایپ گروپ کے سکالرز کی طلب پہ سافٹ میں تبدیل کی گئی ہے۔ مصنفِ کتاب کے لیے نیک خواہشات کے ساتھ سافٹ بنانے والوں کے حق میں دعائے خیر کی استدعا ہے۔

زیرِ نظر کتاب فیس بک گروپ "کتب خانہ" میں بھی اپلوڈ کر دی گئی ہے۔
گروپ کالنک ملاحظہ کیجیے :

https://www.facebook.com/groups/1144796425720955/?ref=share

میر ظہیر عباس روستمانی

03072128068

جب گدھ لوٹ آئے

(افسانوی مجموعہ)

شفیق مسعود

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی۶

JAB GIDH LAUT AAYE
(Short Stories)

by: Shafiq Masood

Edited by
Liaqat Jafri
Umer Farhat

Year of Edition 2017
ISBN 978-93-86486-61-5

Price Rs. 150/-

نام کتاب	:	جب گدھ لوٹ آئے (افسانے)
مصنف	:	شفیق مسعود
ترتیب	:	لیاقت جعفری / عمر فرحت
قیمت	:	۱۵۰ روپے
اشاعت	:	۲۰۱۷
تعداد	:	۵۰۰
مطبع	:	روشان پرنٹرس، دہلی۔٦
پیش کش	:	تفہیم پبلی کیشنز، راجوری

ملنے کے پتے

☆ شب خون کتاب گھر، الہ آباد

☆ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ ☆ تفہیم پبلی کیشنز، راجوری

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3191,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephindia@gmail.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

ماموں!

شفیق مسعود مرحوم

اور

اُن کے تخلیقی شعور کے نام

''کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور''

عمر فرحت

آ کر گرا تھا کوئی پرندہ لہو میں تر
تصویر اپنی چھوڑ گیا ہے چٹان پر
(شکیب جلالی)

مضامین و تاثرات

افسانے

☆☆

لکھے بلراج کومل

شفیق مسعود کی افسانہ نگاری

مرحوم شفیق مسعود کی عمر صرف ۳۱ سال تھی جب ۱۹ جون ۱۹۹۸ء کو ان کا انتقال ہوا۔ آپ اس وقت تک عرصہ ٔ حیات میں اپنا تخلیقی دائرہ ٔ کار خاصا وسیع کر چکے تھے۔ مختصر افسانہ ان کا ترجیحی دائرہ تھا۔ انہوں نے ۱۹۹۰ء سے افسانے لکھنا شروع کیا اور ان کے افسانے ہندوستان کے معیاری رسائل میں شائع ہوتے رہے۔ آپ اعلیٰ تعلیم سے بھی سرفراز تھے۔ آپ نے ایم اے کا امتحان اچھے نمبرات سے پاس کیا تھا۔ آپ کے عرصہ ٔ حیات میں آپ کے افسانوں کا کوئی مجموعہ شائع نہیں ہو سکا۔ ان کی تخلیقات کو کتابی صورت میں شائع کرنے کا کام ان کے ہونہار بھانجے عمر فرحت نے اپنے ذمے لیا ہے عمر فرحت اپنے طور پر یہ کامیاب تخلیق کار ہیں۔ شاعری اور افسانوں کے علاوہ ''نراکار'' کے نام سے آپ کا ناولٹ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ اپنے عزیزوں اور بزرگوں کو ان کی موت کے بعد بھول جاتے ہیں۔ یہ عمر فرحت کی اپنے ماموں کے تئیں گہری وابستی اور عقیدت کا ثبوت ہے کہ انہوں نے یہ نیک قدم اٹھایا ہے۔ میں ان کو اپنا حرفِ ستائش پیش کرتا ہوں۔ یوں تو شفیق مسعود کے تمام افسانے متنوع موضوعات اور کامیاب تخلیقی حصول کے حامل ہیں لیکن میں ان کے چند افسانوں کی طرف قارئین کو متوجہ کرنے کے مقصد سے قدرے تفصیل سے اشارہ کرنا چاہوں گا۔ یہ افسانے کئی اعتبار سے ان کے نمائندہ افسانے ہیں۔

☆ جب گدھ لوٹ آئے

شفیق مسعود کا اہم افسانہ ہے۔عمر فرحت نے مجموعے کا نام بھی یہی رکھا ہے۔ ایک میدان ہے جہاں انسانی لاشیں پڑی ہوئی ہیں۔لاشوں کی بے رونق آنکھیں ان کی اندرونی کیفیت کی چغلی کھا رہی ہیں۔ان لاشوں کے علاوہ وہاں ایک آنکھ والا کانا کتا ہے۔گدھ مردہ خور گدھ لاشوں کو نوچنے اور کھانے کے لئے پہنچ تو گئے ہیں لیکن وہ یہ کام شروع کرنے سے پہلے ایک ادھیڑ عمر گدھ کے کہنے کے مطابق کسی بڑے کا انتظار کر رہے ہیں۔گدھوں کو مریل کانے کتے کی موجودگی ناگوار گزرتی ہے لیکن مسلسل انتظار کے بعد بھی گدھ اس بدبودار لاش کی طرف بڑھنے سے گریز کرتے ہیں جو اندرونی کیفیت والی آنکھوں کی مالک لاشوں سے گھری ہوئی ہیں۔

بالآخر سارے گدھ کانے کتے پر ٹوٹ پڑتے ہیں جو کب کا دم توڑ چکا تھا۔ گدھ، کتا، بدبودار لاش، لاشوں کا ہجوم، نوجوان گدھ، ادھیڑ عمر گدھ، یہ سب ''کردار'' یا عناصر افسانہ کو بار بار پڑھنے کے لئے متوجہ کرتے ہیں۔''انتظار'' افسانے کا بنیادی پہلو ہے اور متضاد امکانات کا غماز ہے۔

☆ منزل

ہمالہ کی گود میں ایک بستی ہے جہاں ایک کسان بار بار آسمان کو دیکھتا ہے، اس انتظار میں کہ ابابیلیں کب آئیں گی۔لیکن ابابیلوں کے بجائے سیاہ پرندے آسمان میں اڑتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔یہ سیاہ پرندے فصلوں کو تباہ کر دیتے ہیں۔اس کا گھر اجاڑ دیتے ہیں۔کسان اپنے اجڑے ہوئے گھر کو دیکھتا ہے اور پھر اندھیری سرد رات کی پرواہ کیے بغیر وہاں سے چل پڑتا ہے۔صبح دم اچانک اسکی نگاہ ایک شاہین بچے پر پڑی جو آسمان سے دھرتی کی جانب غوطے لگا رہا تھا۔یکا یک شاہین بچے کے سامنے ایک بہت بڑی چیل دکھائی دی۔شاہین بچے نے اپنے شکار کو پہچان لیا اور اس پر حملہ کر دیا۔لیکن چیل بچ کر نکل

گئی۔شاہین بچہ بالآخر چیل کو مارنے میں کامیاب ہوگیا۔اس کی آنکھوں کی عقابی چمک اس کی منزل پر پہنچنے کی خوشی کی غماز تھی۔کسان نے یہ سب دیکھا اور پھر نئے عزم کے ساتھ اپنے اجڑے ہوئے گھر کی جانب واپس چل پڑا۔

☆ وہ آئے گی

ایک خوبصورت لڑکی ایک نوجوان لڑکے کیساتھ محبت کرتی ہے لیکن جب اس کو پتہ چلتا ہے کہ وہ لڑکی مفلوک الحال ہے تو وہ منہ پھیر لیتی ہے۔افسانے کا مرکزی کردار ''میں''،مسلسل انتظار کرتا ہے،اس اُمید کے ساتھ کہ وہ آئے گی،اُسے آنا ہی ہوگا۔

☆ ناخدا

ایک بوڑھا کم سن لڑکا سمندر کے ساحل پر کھڑا ہاتھ میں لاٹھی تھامے کسی کا انتظار کرتا ہے۔لیکن لاٹھی کو دیمک چاٹ چکی ہے۔اس کے آس پاس کے دیمک زدہ لوگ بھی دیمک سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہیں وہ بھی نجات چاہتا ہے۔کمزور بوڑھا ساحل سمندر پر کھڑا ایک نیا عزم اپنے اندر محسوس کرتا ہے۔اچانک سمندر میں طوفان اٹھتا ہے۔ایک امکان پیدا ہوتا ہے کہ شاید یہ طوفان کسی شکست خوردہ جہاز کو گمنام جزیرے کی طرف دھکیل دے۔واقعی ایک شکستہ جہاز ساحل سمندر پر پہنچ گیا جس میں ناخدا سوار تھا۔وہ ناخدا اپنے ساتھ ایک نیا عزم نیا امکان لے کر آیا۔اس کو دیکھ کر دیمک زدہ لوگوں میں امید از سرِ نو جاگ اٹھی۔

☆ کینسر وارڈ

نسبتاً طویل افسانہ ہے لیکن اپنے اندر وسیع جہانِ معنی لیے ہوئے ہے۔ایک کینسر وارڈ ہے جس میں ایک شخص موت اور زندگی کی جنگ لڑ رہا۔اس کو زندہ رکھنے کی تمام کوششیں ناکام ہو چکی ہیں۔سب رشتہ دار عزیز یہاں تک کہ اس کی محبوبہ بھی منہ موڑ چکی

ہے۔اس تاریک منظر یں صرف اس کی ماں ہے، جو دائمی پرنور فرشتہ کی طرح اس کا دائم ساتھ دیتی ہے۔لحہ مرگ میں بھی مریض کے ہونٹ لفظ''ماں'' کہنے کے لئے کھلے ہوتے ہیں۔شفیق مسعود نے اپنے تمام افسانوں میں،جن میں مندرجہ بالا افسانے بھی شامل ہیں جن کا ذکر میں نے بطور خاص کیا ہے،روشنی اور تاریکی کی آویزشوں کو اپنے حق کی بنیاد بتایا ہے۔آویزشوں کا عمل مسلسل ہے اور حیاتِ کا جز و لاینفک ہے۔شفیق مسعود کے جملہ سروکار بنیادی انسانی اور سماجی نوعیتوں سے منور ہیں۔موضوعات کی اہمیت،اعلیٰ فنی کارکردگی اور اسلوب و اظہار کی باترسیل کشش نے ان کے افسانوں کو اصطلاحات کے جبر سے آزاد کر دیا ہے اور ہر لحاظ سے لائق مطالعہ بنا دیا ہے۔مجھے پوری امید ہے کہ قارئین افسانوں کے اس مجموعے کا خیر مقدم کریں گے۔

۲۹ فروری ۲۰۱۲

☆☆

ڈاکٹر انور سدید

ایک غیر معمولی افسانہ نگار، شفیق مسعود

شفیق مسعود کے چند افسانوں کو پڑھ کر جو سب سے پہلی بات مجھے محسوس ہوئی وہ یہ کہ یہ سب افسانے بالکل الگ ہیں۔ ان میں چھیڑے گئے موضوعات، اٹھائے گئے سوالات اور بیان کئے گئے نکات سب کچھ ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ کرداروں میں ایسی کوئی مماثلت نظر نہیں آتی کہ ایک افسانے کا کوئی کردار کسی دوسرے افسانے کے کسی کردار کی یاد دلائے یا تسلسل محسوس ہو یا پھر کسی کے مزاج کا رنگ کہیں اور چھلکتا نظر آئے۔ کسی کے لہجے پر کسی دوسرے کی چھاپ دکھائی دے۔ غرض یہاں جو کچھ ہے اسے ہم تنوع یا رنگا رنگی کا ہی نام دے سکتے ہیں۔ شفیق مسعود کے جتنے افسانے عمر فرحت کی وساطت سے میری نظروں سے گزرے ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ اُن کے یہاں رنگا رنگ اور پُر تنوع صورت حال ہمیں نظر آتی ہے۔

اچھا تو اب اس کی داد یہ ہو سکتی ہے کہ اُن کا افسانوی منظر نامہ بہت وسیع ہے یا یہ کہ کینوس بڑا یا لمبا یا چوڑا وغیرہ ہے۔ ظاہر ہے اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک بات تو ہے اور اس کی بھی داد شفیق مسعود کو ملنی چاہیے۔ تاہم کیا کسی فن کار کی فکری و فنی حیثیت محض اس تکنیکی بنیاد پر مسلمہ ہو سکتی ہے کہ اس کے یہاں کینوس بہت وسیع ہے یا یہ کہ اس نے بہت سے موضوعات کو چھوا ہے یا پھر یہ کہ اس کے یہاں زندگی کے بارہ، بیس یا پچاس رنگ سمٹ آئے ہیں۔ میں نہیں مانتا کہ صرف اس بنیاد پر کسی فن کار کے اصل منصب کا تعین کیا جا سکتا ہے۔ دیکھنے کی جو بات ہے وہ تو یہ ہے کہ یہ سارے رنگ مل کر کیا شئے بناتے

ہیں۔یعنی دوجمع چارضرب پانچ تقسیم چھ........ان تمام کا حاصل کیا نکلا؟

اصل میں یہ جو حاصل ہوتا ہے، یہ فن کار کے فن کی وحدت یا کلیت کو بیان کرتا ہے۔گویا وسعت یا لمبائی چوڑائی کے کوئی معنی نہیں ہیں اگر ان کے ساتھ گہرائی بھی ہمارے سامنے نہ آرہی ہو۔رنگا رنگی ی دای یہ نہیں کہ فنکار آپ کی آنکھوں میں قوس قزح بھر دی بلکہ بات تو یہ ہے کہ ان رنگوں نے ل مل کر اُس رنگ کو آپ کے اندر جگایا کہ نہیں جو ظاہر آنکھوں کے آگے موجود نہیں تھا۔

یہی وہ شئے ہے جو فن کی دلیل بھی ہے اور اس کا جواز بھی۔

اصل میں اب انسانی زندگی کے جس تجربے کو معرض بیان میں لاتا ہے وہ بظاہر کتنا ہی سادہ نظر آئے بباطن وہ سادہ یا اکہرا نہیں بلکہ پیچیدہ اور تہہ دار ہوتا ہے۔یہ فن کی بلندی اور فنکار کی ہنرمندی ہے کہ وہ اسے پیش کرتے ہوئے چیستان بنانے کے بجائے حقیقتِ معلومی سطح پر روز مرہ محاورے میں بیان کر دے۔اس کے لئے اسے کبھی تو نقطے کو پھیلا کر دائرہ بنانا پڑتا ہے اور کبھی پھیلے ہوئے دائرے کو نقطے میں سمیٹ کر دکھانا ہوتا ہے۔یہ فن کے تقاضے کا معاملہ ہے۔اپنے افسانوں کی روشنی میں مرحوم شفیق مسعود اپنے فن اور اس کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ شفیق مسعود کے افسانے اردو افسانے کی روایت سے الگ نہیں ہیں لیکن انہیں روایتی افسانہ نگاری کے زمرے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔کسی تحریر کا روایت سے منسلک ہونا اور روایتی ہونا دو مختلف چیزیں ہیں۔یہ افسانے اردو افسانے کی روایت سے الگ اس لئے نہیں کہ ان میں اس فن کی بنیاد یعنی کہانی سے کنارہ کشی نہیں کی گئی۔یہ وہی روایت ہے جو پریم چند سے ہوتی ہوئی کرشن چندر، منٹو اور بیدی کے ذریعہ ہم تک پہنچتی ہے۔

شفیق مسعود کے افسانوں کو روایتی ہم اس لئے نہیں کہہ سکتے کہ ان میں کہانی کے علاوہ بھی بہت کچھ ہے۔اور اس بہت کچھ میں لکھنے والے کا اسلوب، کردار نگاری اور ماحول کی تصویر کشی کے علاوہ اچھے افسانے کی تمام خوبیاں گنوائی جا سکتی ہیں۔میں صرف ایک چیز

کی طرف اشارہ کروں گا کہ روایتی افسانے میں عموماً واقعات کردار کی تشکیل کرتے ہیں لیکن شفیق مسعود کے ہاں کردار مختلف ذہنی رویوں کے اظہار کی علامت ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ بات یوں کہی جاسکتی ہے کہ شفیق مسعود کے کردار معاشرے کے مختلف طبقات کی نمائندگی نہیں کرتے، بلکہ ان طبقات کے باہمی تعلق سے جو ذہنی رویے تشکیل پاتے ہیں ان کی عکاسی کرتے ہیں، ان کے بیشتر افسانوں کا بنیادی کردار صیغہ واحد متکلم ہے۔ یہ رویہ فرد اور فرد کے تعلق سے بھی ہے اور فرد اور معاشرے کے تعلق سے بھی۔

شفیق مسعود نے انہیں رویوں اور انہیں تعلقات کو دیکھا، سمجھا اور پرکھا ہے۔ کہیں وہ کامیاب ہوئے ہیں اور کہیں ناکام۔ کامیابی بھی ان کی اپنی ہے اور ناکامی بھی ان کی اپنی کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر اپنا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے اور اس قسم کی کوشش کرنے والے خود ناکام ہوں یا کامیاب، بعد میں آنے والے مشکلوں کو کسی قدر آسان ضرور کر دیتے ہیں۔

شفیق مسعود کے افسانے پڑھ کر مجھے یہ بھی محسوس ہوا کہ زندگی اور سماج کے حوالوں اور سوالوں کو موضوعِ اظہار بنانے کے باوجود شفیق مسعود کے افسانے ہمارے افسانوی مزاج سے مغائرت کا رشتہ نہیں رکھتے۔ ان کے فن کے اگر کچھ الگ اور مخصوص نشانات ہیں تو اس کے ساتھ ہی وہ اردو افسانے کی فکری وفنی فضا سے بھی مربوط ہیں۔

اب یہ سوال کرنا کہ شفیق مسعود نے افسانے کم کیوں لکھے یا جو لکھے بھی سہی ان کی طرف ایسی بے نیازی کا انداز کیوں اختیار کیا کہ وہ اُس طور پر منظرِ عام پر نہ آسکے جس طرح انہیں آنا چاہیے تھا اور پھر اس طرح کی گفتگو کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا کہ انہوں نے اپنے تخلیقی جوہر کے ساتھ بڑا ظلم کیا ہے یا یہ کہ اردو ادب کے ساتھ بڑی زیادتی کے مرتکب ہوئے ہیں کہ اپنی نگارشات کو جو ادبِ عالیہ شہ پارے ہیں، منظرِ عام پر نہیں لائے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کی باتیں کوئی معنی نہیں رکھتی ہیں۔ اگر کبھی ان باتوں کے کوئی معنی تھے بھی سہی تو آج بہرحال نہیں ہیں کیوں کہ ایسی باتیں یہاں ان لوگوں کے بارے میں کہی جاچکی ہیں جن کا لکھنا یا نہ لکھنا برابر تھا (بلکہ نہ لکھنا ہی بہتر تھا)۔ چنانچہ شفیق مسعود کا اپنے افسانے کے بارے

میں جو بھی اندازِ نظر رہا ہو لیکن انہیں ان افسانوں کو مرتب بہر حال کرنا چاہیے تھا۔ جو چند سرسری باتیں سطورِ گزشتہ میں ان کے افسانوں کی بابت کہی گئی ہیں وہ ادب کے ایک ادنیٰ قاری کے محض تاثرات کا درجہ رکھتی ہیں جبکہ یہ افسانے اس سے زیادہ توجہ کے طالب ہیں۔

۱۲ اگست ۲۰۱۲

☆☆

✍ زبیر رضوی

جب گدھ لوٹ آئے......ایک تاثر

اردو کے قومی منظرنامہ میں اُن لکھنے والوں سے قارئین کو متعارف کرانے کی کوششیں بہت کم کی گئی ہیں جو اردو کے مرکزوں اور آبادیوں سے دور علاقوں میں اپنے قومی دھارے کی پہچان سے دور رہ کر جنون کی حکایتِ خوں چکا کر رقم کرتے رہے ہیں۔ جموں و کشمیر کے درمیان پہاڑی سلسلوں سے گھرا راجوری ایک ایسا علاقہ ہے جہاں اردو کے کئی پرانے اور نئے ادیب اپنے سخن کدوں میں اپنی تحریروں سے فکر وخیال کی کشیدہ کاری کرتے ہوئے پُر اُمید اور شاد کام نظر آتے ہیں۔

ایسے ہی ایک افسانہ نگار شفیق مسعود بھی تھے جن کے کچھ افسانے مجھے ان کے عزیز عمر فرحت کی توسط سے پڑھنے کو ملے۔ عمر فرحت کی خوبی یہ ہے کہ معاصر تخلیقی ادب سے خود کو باخبر رکھتے ہیں اور اس کے مطالعے سے خود کو سرشار رکھتے ہیں۔ ہم دونوں میں اکثر نئے ادب سے متعلق بہت دیر تک باتیں ہوتی ہیں۔

شفیق مسعود کے افسانے ''ناخدا'' ''منزل'' اور ''وہ آئے گی'' پڑھ کر احساس ہوا کہ یہ افسانے ایسے مستقبل کی آہٹوں اور انتظار کا استعارہ بن گئے ہیں جو جبر کو انصاف میں، اندھیرے کو روشنی اور دھوپ کو سائے میں بدل جانے کا مژدہ سنا دے۔

''جب گدھ لوٹ آئے'' افسانے میں نحیف و نزار وہ لاش نما انسان جن کی آنکھیں اُمید سے روشن ہیں، گدھوں کی نوکیلی چونچوں اور پنجوں سے نوچے جانے سے اس لئے محفوظ رہتے ہیں کہ اُن میں زندہ رہنے کا جذبہ مرا نہیں، زندگی کی یہی اُمید بھری رمق اُن

کے تحفظ کی ضمانت بن جاتی ہے۔ کیونکہ گدھ تو مردہ خور ہے۔ ''کینسر وارڈ'' میں مرکزی کردار آفاق کی دوست ستارہ کو جب معلوم ہوتا ہے کہ وہ کینسر کا مریض ہے تو یہ جذباتی رشتہ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔ آفاق کی آنکھیں جب دھندلکوں میں ڈوبنے لگتی ہیں تو ماں کا مہربان وجود اس کے آنسوؤں کو اپنے دامن میں جذب کر لیتا ہے مگر موت کی منہ زور آندھی سے ماں کا کفِ دست بیٹے کے چراغ زیست کو گُل ہونے سے نہ بچا سکا۔

شفیق مسعود کے مذکورہ چند افسانے پڑھ کر میں نے اپنا تاثر قلم بند کر دیا، ورنہ عمر فرحت کے اصرار کی دستکیں جاری رہتیں۔

۲۰ جولائی ۲۰۱۱

☆☆

تاثرات

✍ نیر مسعود

''شفیق مسعود کا افسانہ ''جب گدھ لوٹ آئے'' جدید افسانے کی ایک اچھی مثال ہے۔اس افسانے کا علامتی موضوع فی الحقیقت نہایت پیچیدہ ہے۔ علامتی سطح پر یہ موضوع انسان کے مقدر کی شدید اور ڈرامائی جستجو، نامانوس، اجنبی اور حیرت آور ماحول میں زندگی کی معصومیت کے احساس سے محروم ہو جانے، موت کے قطب اور ناگزیری اور حیات بعد الموت وغیرہ کے پیچیدہ مفاہم کو محیط ہے۔''

✍ وارث علوی

'' عمر فرحت جوان افسانوں کو ترتیب دے رہے ہیں، خود بھی اچھے قلم کار ہیں۔ انہوں نے بڑی محنت سے مختلف رسائل و اخبارات سے یہ افسانے جمع کیے اور انہیں زیور طباعت سے آراستہ کیا۔۔ مرحوم شفیق مسعود کے کچھ افسانوں میں علامتی اور تجریدی انداز دنوں کھل مل گئے ہیں'' جب گدھ لوٹ آئے''،'' ناخدا'' اس کی مثال ہے ان افسانوں کا موضوع اس کہانی کی تلاش ہے، جو ہمارے اردگرد پھیلی ہوئی ہے۔ جسے ہم گزار رہے ہیں۔ لیکن اسے کوئی نام نہیں دے سکتے۔ یہ بے بسی، محرومی اور مجبوری کی کہانی ہے۔ جو اپنے کرداروں کے ہونے کا مفہوم ماحول کے حوالے سے دریافت کرتی ہیں۔ شفیق مسعود ایسا افسانہ نگار ہے جو صورت حال کو کہانی سمجھتا ہے اور اس میں سے انسان اور زندگی کا مفہوم

تلاش کرتا ہے۔ شفیق مسعود آج ہمارے درمیان نہیں ہیں ۱۹۹۸ء میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ ایسی صورت میں اکثر ہوتا یہ ہے کہ جواں مرگ ہوئے تو ادیب کا مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مواد تلف ہو جاتا ہے۔ یہاں اطمینان کی بات یہ ہے کہ شفیق مسعود کے بھانجے عمر فرحت نے تیرہ سال بعد اپنے محسن کے افسانوں کو منظر عام پر لانے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ عمر فرحت کی یہ کاوش قابل قدر ہے۔''

بلراج مین را

'' شفیق مسعود کے چند افسانے عمر فرحت کی وساطت سے پڑھنے کے بعد یہ احساس شدت سے ہوا کہ شفیق مسعود کے لیے افسانے محض تفریح طبع کا سامان نہیں بلکہ بیشتر کی پیچیدہ، گہری اور دوررس حقیقت کے انکشاف کا ذریعہ ہے۔ انہوں نے اپنے عہد کی مخصوص حسیت، نفسیاتی رویوں اور تضادات کا عرفان حاصل کیا ہے اور ایک فطری سادگی کے ساتھ ان کو لفظوں کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اس مجموعے میں اہم افسانے ''جب گدھ لوٹ آئے''، ''ناخدا'' اور ''کینسر وارڈ'' ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے فنکار کی نفسیاتی ژرف نگاہی سے صحیح معنوں میں پہلی بار متعارف ہونے کا موقعہ ملتا ہے۔''

شکیل الرحمٰن (باباسائیں)

''شفیق مسعود (مرحوم) کے چند افسانے نظر سے گزرے۔ اُن میں ایک اچھے افسانہ نگار کی چند ایسی خوبیاں نظر آئیں جو کہ توجہ طلب بن گئیں۔ ''جب گدھ لوٹ آئے'' اور ''کینسر وارڈ'' وغیرہ ان کی نمائندہ کہانیاں ہیں۔ مرحوم شفیق مسعود کے افسانوں میں اکثر علامتوں کا استعمال ملتا ہے۔ کہانی سناتے ہوئے وہ علامتی اسلوب اختیار کرتے ہیں تو لگتا ہے ان میں کہانی لکھنے کی عمدہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ کاش وہ زندہ رہتے اور اُردو افسانوں کو زندہ رہنے والی کہانیاں دے جاتے۔ افسوس وہ ۳۱ برس کی عمر میں ۱۹۹۸ء میں گزر گئے۔ لکھنے کی اچھی صلاحیت تھی جس کی وجہ سے ان کے افسانے اردو کے بعض مقبول رسالوں میں

شائع ہوئے۔عمر فرحت جوخود اچھے شاعر ہونے کے علاوہ اچھے فکشن نگار بھی ہیں جن کا ناولٹ ''نراکار'' شائع ہوکر خاص وعام میں مقبول ہو چکا ہے،مرحوم شفیق مسعود کے افسانوں کا انتخاب شائع کررہے ہیں۔میری نیک خواہشات اور دعائیں ان کے ساتھ ہیں''

✍ پروفیسر شہریار

''شفیق مسعود کے یہاں جدید افسانہ اور روایتی افسانہ کا ایک ایسا امتزاج پیدا ہوتا ہے کہ اپنی نسل کے افسانہ نگاروں میں ان کی حیثیت ایک نمائندہ افسانہ نگار کی ہوتی ہے اور شفیق مسعود کے فن کو کسی انداز سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا''

✍ پروفیسر وہاب اشرفی

''مرحوم شفیق مسعود کے یہاں نیا انداز بھی ہے اور کہانی کا نیا تیور بھی، حساس طبیعت کو تلملا دینے والا بھی اور انبساط دینے والا بھی، درد کے گہرے سمندر میں کروٹیں بدلتا ہوا انسانی وجود کس قدر بے بس ہو جاتا ہے اس کا نقش بھی ابھرتا ہے۔

شفیق مسعود نے کہانی کے Treatment کو نئے فنی لوازمات سے بھی آراستہ کرنے کی کوشش کی ہے جس سے کہانی کا ایک نیا ذائقہ پیدا ہوتا ہے اور یہ پیرایہ، اظہار شفیق مسعود کو کامیاب افسانہ نگاروں کی صف میں لے آتا ہے۔یہ مجموعہ قابل قدر ہے''

✍ پروفیسر حامدی کاشمیری

''راجوری سے جواں سال ادیب عمر فرحت کی خواہش پر میں نے ان کے ماموں شفیق مسعود کے چند افسانوں پر نظر ڈالی، تو حیرت اور مسرت کے ملے جلے جذبات سے دوچار ہوا۔یہ افسانے ایک جواں مرگ اور تازہ کار افسانہ نگار کے تخلیقی ذہن کی پیداوار ہیں، افسانوں کو پڑھنے سے قبل میرا یہ خیال تھا کہ کم عمری میں لکھے گئے افسانے بھی ان کی شروع کی نومشقی کے آئینہ دار ہوں گے، لیکن میں نے جب ان کا مطالعہ کیا تو میرے خرشات اور

اندیشے نقش بر آب ثابت ہوئے ۔ شفیق مسعود سب سے پہلے افسانے کے فنی لوازم یعنی اختصار پسندی ، زبان کی روانی اور کردار کی شخصیت کو اہمیت دیتے ہیں ۔ شفیق مسعود کے افسانوں کی زبان شاعرانہ کہی جا سکتی ہے ۔ ان کی عبارت ،تہہ داری معنویت سے پر ہوتی ہے ۔ خاص طور سے استعاروں کا استعمال ان کی زبان کی خوبی ہے جس نے ان کے اسلوب میں ایک انفرادیت پیدا کر دی ہے ۔"

✍ پروفیسر عتیق اللہ

"شفیق مسعود میرے لیے ایک مانوس نام ہے ۔ ان کے افسانوں کو میں دلچسپی سے پڑھتا رہا ہوں ۔ ان میں فکشن کی غیر معمولی صلاحیت موجود تھی ۔ افسانے کا فن ایک مشکل فن ہے ۔ فکشن کے لیے زندگی کے گہرے تجربات کا اثاثہ ضروری ہے ۔ جب تک کہ مشاہدہ تیز نہ ہو اور تجربات وسیع نہ ہوں ، افسانے کے فن پر قادر نہیں ہو سکتا ۔ شفیق مسعود جو افسانوی فہم رکھتے ہیں ، وہ بہت کم افسانہ نگاروں میں پائی جاتی ہے ۔ انہیں واقعہ کو دہرانے کا ہنر آتا ہے ۔ کردار کے باطن کو سمجھنے کی نظر رکھتے ہیں جو جزئیات کی تفصیل پیش کرنے کے بجائے انہوں نے ہر سطح پر ایجاز و اجمال سے کام لیا ہے ۔ کہیں کہیں علامتی رنگ پایا جاتا ہے ۔ انہوں نے کسی نظریہ کو اپنے لئے مشعل راہ نہیں بنایا بلکہ اپنی نظر پر زیادہ بھروسہ کیا ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اللہ اگر انہیں اور مہلت دیتا تو وہ یقیناً ہمارے دور کے بہترین افسانہ نگاروں میں شمار کیے جاتے ۔ وہ اپنے فن کو اور جلا بخشتے ، ان کا فن مزید پختہ ہوتا اور افسانے کو ایک معتبر نام مل جاتا ۔"

☆☆

✍ عمر فرحت

پیش لفظ

اردو ادب پر جدیدیت کا احسان ہے کہ ادیب جو بات عتاب حکمران کے سبب کھل کر نہیں کر پاتا تھا وہ بات اس نے اشاروں اور کنایوں میں کہی اور قاری کو اس مدعا سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ اس تحریک نے سب سے زیادہ فروغ پاکستان میں بیسویں صدی کے چھٹی اور ساتویں دہائی میں پایا کیونکہ حکومت نے ادب اور ذرائع ابلاغ پر غیرضروری پابندیاں عائد کی تھیں۔ ہندوستان میں تو یہ تحریک آج بھی اپنے شباب پر ہے۔ شعرا حضرات کے علاوہ افسانہ نگاروں نے بھی ترسیل خیالات کے لئے ترقی پسندی سے ہٹ کر ایک نئی راہ نکالی جس نے ادب پر اپنی گہری چھاپ چھوڑی۔ شفیق مسعود (جو میرے ماموں جان ہیں) اسی تحریک کی ایک اہم آواز تھے مگر بدقسمتی سے یہ آواز بہت جلدی ہم سے چھن گئی۔

شفیق مسعود کا جنم یکم مارچ ۱۹۶۳ء میں جموں کشمیر کے دور دراز سرحدی علاقہ راجوری میں ہوا، جہاں انہوں نے خود کو ہمیشہ غیر محفوظ حالات میں جکڑا ہوا پایا۔ ۱۹۸۹ء میں ایم اے سماجیات اور ایم اے انگریزی کی ڈگریاں حاصل کر کے وہ گورنمنٹ سکول میں بحیثیت ٹیچر کام کرنے لگے۔ اپنی ذہانت، محنت اور لگن کے بل بوتے پر انہوں نے ۱۹۹۰ء میں انڈین پولیس سروس (IPS) امتحان پاس کر لیا لیکن شومیٔ قسمت کہ انہی دنوں ریاست میں ملی ٹینسی پھیل گئی اور انہیں شبہ کی بنا پر گرفتار کر لیا گیا۔ ادھر نوکری چلی گئی اور ادھر امتحان کی اگلی منزل طے نہیں ہو پائی۔ یکم جون ۱۹۹۸ء میں شفیق مسعود اپنے گھر کی چھت سے گر کر ۱۹

جون ۱۹۹۸ء میں جموں میڈیکل کالج میں انتقال کر گئے۔

البتہ وہ اپنے پیچھے چند انمول افسانے چھوڑ گئے۔ یہ افسانے ہندو پاک کے غیر معمولی اخبارات ورسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

افسانوی مجموعہ'' جب گدھ لوٹ آئے'' میں نئے لب و لہجے کا پرتو صاف طور نظر آتا ہے۔ شفیق مسعود نے اپنے افسانوں میں استعاروں اور علامتوں کے ذریعے ایسے موضوعات کو قلم بند کیا ہے جن کو موجودہ تناظر میں شاید کھلے طور پر بیان کرنا مشکل ہو جاتا۔ افسانہ' جب گدھ لوٹ آئے' میں وہ اپنی قوم کے افراد کو لاشوں سے مشابہت کرتے ہیں کیونکہ ان میں اپنا منصب پانے کی نہ چاہ ہے اور نہ عملی قوت حالانکہ برسر اقتدار لوگ، جنہیں وہ گدھ کہتے ہیں، بخوبی جانتے ہیں کہ اگر وہ جاگ اٹھیں گے تو غضب ہوگا۔ چنانچہ گدھوں کو مردار کھانے کی عادت ہے اس لیے وہ کم سے کم سڑی ہوئی لاش کو کھانا چاہتے ہیں لیکن وہاں بھی خطرہ پا کر آخر کار نتیجے مردہ کانے کتے پر پل پڑتے ہیں۔ ' منزل' بھی بہت ہی خوبصورت کہانی ہے جس میں اساطیری علامت 'ابابیل' کو استعمال کیا گیا ہے۔ کسانوں کو انہی ابابیلوں کا انتظار ہے کہ کب وہ اتر آئیں اور ان کے کھیتوں کو سرسبز و شاداب کر لیں مگر ہوتا اس کے برعکس ہے۔ ابابیلوں کے بدلے ابابیل نما خونخوار پرندے اتر آتے ہیں جو ہر سو تباہی و بربادی مچاتے ہیں۔ یہ کہانی کشمیر کے موجودہ حالات کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ اس کے باوجود افسانہ نگار امید کا دامن نہیں چھوڑتے اور آخر کار ایک شاہین بچے کو چیل سے لڑواتا ہے اور اس کو فاتح قرار دیتا ہے۔ افسانے میں جو دوسری بات دیکھنے کو ملتی ہے وہ یہ ہے کہ شفیق مسعود علامہ اقبال سے بہت ہی متاثر ہیں اور اسی لیے شاہین کی پرواز اور قوت پر ناز کرتے ہیں۔ افسانہ' کینسر وارڈ' میں بیانیہ انداز اپنایا گیا ہے جو جذباتیت سے لبریز ہے۔ اس افسانے میں کینسر میں مبتلا ایک نوجوان آفاق بستر مرگ پر زندگی کی حقیقتوں کا سامنا کرتا ہے۔ اس کی معشوقہ ستارہ جو کبھی اس کے قدموں کی دھول چومتی تھی، اسے کنارہ کش ہو جاتی ہے اور اسی طرح اس کا جگری دوست تبریز بھی اس کی بیماری کی خبر سن کر اس سے دور دور رہنے لگتا ہے جیسے وہ کسی چھوت کی بیماری میں مبتلا ہو۔ اس کے برعکس آفاق کی بیوہ ماں

اس کے لیے آٹھ آٹھ آنسو بہاتی ہے اور ہر دم دعا کرتی ہے کہ وہ صحت یاب ہو جائے جبکہ اسے یہ معلوم ہے کہ اس کی دعا کا کوئی اثر نہیں ہوگا۔ باقی ماندہ افسانے بھی اسی نہج کے ہیں جن میں نہ صرف افسانہ نگار نے اپنے قلب و ذہن کی ترجمانی کی ہے بلکہ اپنے ماحول کو بھی بڑی خوبصورتی سے منعکس کیا ہے۔ان کے افسانوں میں آپ بیتی بھی ہے اور جگ بیتی بھی ۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ کم سنی میں شفیق مسعود سیاسی طور پر بالغ النظر دکھائی دیتے ہیں کیونکہ ان کے ذہن کو علامہ اقبال کی شاعری نے جلا بخشی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے افسانوں میں جا بجا سیاسی موضوعات ملتے ہیں اور وہ ان مسائل کا پر امن حل ڈھونڈنے کی جستجو کرتے ہیں۔ جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے، ان کے یہاں فکر کا دخل بھی ہے اور تصور کی رنگ آمیزی بھی، سلاست بھی ہے اور بلاغت بھی، روانی بھی ہے اور شگفتگی بھی۔

☆☆

✍ عمر فرحت

اظہار تشکر

اس کتاب کی تیاری میں مرحوم ماموں شفیق مسعود کے عزیز دوست اور افسانہ نگار الطاف کشتواڑی صاحب نے گذشتہ سات سال سے جس محبت وشفقت سے میری رہنمائی کی اور ہمت وحوصلہ بڑھایا اس کے لیے ان کا جتنا بھی شکریہ ادا کروں کم ہے۔ ساتھ ہی اپنے استادِ محترم جناب شمس الرحمٰن فاروقی، نیر مسعود، مرحوم بلراج کومل، مرحوم وارث علوی، مرحوم بلراج مین را، مرحوم شہریار، مرحوم وہاب اشرفی، مرحوم شکیل الرحمٰن (بابا سائیں)، مرحوم انور سدید، حامدی کاشمیری، عتیق اللہ اور مرحوم زبیر رضوی کا بے حد ممنون اور مشکور ہوں جنہوں نے اس مجموعے پر اپنے تاثرات قلم بند کیے۔ ساتھ ہی شمس الرحمٰن فاروقی، ظفر اقبال، مرحوم وارث علوی، مرحوم بلراج مین را، نیر مسعود، فضیل جعفری، قاضی افضال حسین، ابوالکلام قاسمی، قاضی جمال حسین، مرحوم سکندر احمد، آفتاب حسین، عمران شاہد بھنڈر، عرفان ستار، فاروق نازکی، دیپک بدکی، انور سین رائے، ناصر عباس نیر، فاروق مضطر، ایاز رسول نازکی، علی اکبر ناطق، نصیر احمد ناصر، محمد حمید شاہد، مرزا حامد بیگ، خالد جاوید، صدیق عالم، صلاح الدین درویش، اقتدار جاوید اور الیاس بابر اعوان کا بھی شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فریضہ سمجھتا ہوں جنہوں نے ہر قدم پر میری ہمت افزائی کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ سرورق بنانے کے لئے میں خالد کرار کا بھی شکرگزار ہوں۔ اس موقع پر اپنے بڑے بھائی لیاقت جعفری کو کیسے فراموش کرسکتا ہوں۔ جنہوں نے اس کتاب کو ترتیب دینے میں میری بھرپور مدد کی۔

☆☆

افسانے

"ایک تاثر خواہ وہ کسی کا ہو، اپنے اوپر مسلط کر کے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے والے پر وہی اثر کرے، وہ افسانہ ہے۔"

سعادت حسن منٹو

جب گدھ لوٹ آئے

بڑا عجیب منظر تھا۔ چاروں طرف لاشیں بکھری پڑی تھیں۔ نوجوان، بوڑھے، بچے، عورتیں سب تھے۔ لیکن تعجب کی بات یہ تھی کہ ہر لاش کے چہرے پر بلا کا سکون تھا اور آنکھیں نیم وا تھیں۔ کہتے ہیں اگر مرنے والے کی آنکھیں کھلی رہ جاتیں تو اس کی کوئی حسرت رہ جاتی ہے یا وہ کسی کا منتظر ہوتا ہے۔ اور ہاں سب کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ان لاشوں کے درمیان ایک مسخ شدہ بدبودار لاش بھی پڑی ہوئی تھی۔ یقیناً اس نے اپنی زندگی میں ایسی لاشیں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ گدھ لاشوں کے چاروں طرف بڑے بڑے بھدے پر پھیلائے پلاسٹک کے گیند کی طرح اچھلتے ہوئے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ شاید وہ کسی ادھیڑپن میں مبتلا تھے، ان کی بے رونق آنکھیں ان کے اندر کی کیفیت کی چغلی کھا رہی تھیں۔

پنجوں کے بل بیٹھا ہوا تیز تیز سانس لیتا ہوا ایک مریل سا، ایک آنکھ سے کانا کتا بھی وہاں موجود تھا۔ اسے صرف ایک طرف ہی نظر آتا تھا۔ دوسری طرف دیکھنے کے لئے اُسے پوری گردن گھمانا پڑتی تھی، اور گردن گھمانے کے لئے اس میں سکت نہ تھی۔ وہ بہت ہی نحیف تھا۔

ایک نوجوان اُچھلتا ہوا اونچے پتھر پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر گدھ کے پاس گیا اور اس سے کہنے لگا: ''جناب لاشیں ہمارے سامنے موجود ہیں، کس بات کی دیر ہے۔ کیا ہم اپنا کام شروع کر دیں؟''

ادھیڑ عمر گدھ نے ڈانٹتے ہوئے جواب دیا: "تم نوجوان بڑے شتاب کار ہوتے ہو، ہر کام جلد بازی میں کرتے ہو اور پھر خمیازہ ہمیں بھگتنا پڑتا ہے اور ہاں جب تک بڑا نہیں آجاتا کچھ نہیں ہوگا" نوجوان نے پھر پوچھا "لیکن یہ بڑا کب آئے گا؟"

دوسرے نے فکر مند ہوتے ہوئے کہا: "ہم سب بھی اس کے انتظار میں سوکھ رہے ہیں"

دونوں گدھوں کے درمیان گفتگو ہو رہی تھی کہ مریل کانے کتے نے نہایت آہستگی سے کروٹ بدلی۔ تمام گدھ اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ گدھوں کو اس کی موجودگی ناگوار گزر رہی تھی۔

ایک نے کہا: "کاش یہ اندھا ہوتا! دوسرے نے کراہت سے اپنی بھدی چونچ دوسری جانب پھیرتے ہوئے کہا اچھا ہی ہوتا اگر یہ مرجاتا!"

کتے نے اپنے دونوں اگلے پنجے زمین میں پسار دیئے اور منہ پنجوں پر رکھ کر اپنی خارش زدہ گردن ڈھیلی چھوڑ دی۔ ادھر آسمان پر گدھوں کا ایک بڑا قافلہ منڈلانے لگا تھا۔ ایک گدھ زور زور سے چلانے لگا: "وہ دیکھو بڑا آگیا ہے" اور پھر تمام گدھ خلا میں گھورنے لگے۔ بڑے کا قافلہ آہستہ آہستہ نیچے زمین پر اتر رہا تھا۔ زمین پر اترتے ہی چند بزرگ گدھ اسے لاشوں کی طرف لے گئے۔ بڑے نے نہایت غور سے لاشوں کا معائنہ کیا تو اس کی آنکھوں میں اداسی کے بادل چھا گئے۔ یہ دیکھ کر ایک گدھ نے نہایت عاجزی سے کہا "حضور حکم فرمائیے! کیا ہم ان لاشوں کا پوسٹ مارٹم شروع کردیں؟ بڑے نے افسردگی سے جواب دیتے ہوئے کہا" تم انہیں لاشیں سمجھتے ہو" پہلے گدھ نے اپنی گنجی گردن ہلاتے ہوئے کہا" جناب یہ لوگ اب زندہ نہیں رہے، یہ مر گئے ہیں اور ہماری روایت ہے کہ ہم لاشوں پر ہی منڈلاتے ہیں اور لاشیں ہی کھایا کرتے ہیں"۔ سارے گدھوں کی توجہ بڑے پر مرکوز ہوگئی۔ اس نے گھمبیر لہجے میں بولنا شروع کیا:" میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ لاشیں نہیں ہوسکتیں۔ ذرا غور سے دیکھو ان کے چہرے پرسکون ہیں جیسے یہ تھکن سے چور ہوکر گہری نیند میں سوئے پڑے ہوں اور دیکھو ان کی آنکھیں بھی کھلی ہیں۔ اور تم کہتے ہو یہ لاشیں ہیں"۔

بڑے نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا اگر ہم نے ان کو نوچنا شروع کیا اور یہ اٹھ کر بیٹھ گئے تو............ بڑے کی آواز پر اسرار ہوتی جا رہی تھی۔

اور اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا '' دیکھو ان لاشوں کے درمیان ایک سڑی ہوئی بدبودار لاش پڑی ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔ وہ ہماری غذا ہو سکتی ہے، اگر روایت کو برقرار رکھنا ہے تو اسے نوچ سکتے ہو''۔ سب گدھ سڑی ہوئی لاشوں کی طرف دیکھنے لگے، بڑے سمیت تمام گدھوں کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ سب سے پیچھے کھڑے ایک بزرگ گدھ نے ٹوکتے ہوئے کہا '' لیکن جناب! ہم وہاں اس گلی سڑی اور بدبودار لاش تک پہنچیں گے کیسے؟ کیا یہ زندہ لاشیں ہمیں وہاں تک پہنچنے دیں گی؟'' سب گدھوں کے جذبات سوڈا واٹر کی جھاگ کی طرح بیٹھتے چلے گئے اور پھر اگلے ہی لمحے سارے گدھ بڑے کے سامنے احتجاج کرنے لگے۔ بڑا گردن جھکائے، آنکھیں موندے، کافی دیر تک ان کی بدکلامی سنتا رہا اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو اس کی نظریں لاشعوری طور پر مریل کانے کتے کی جانب اٹھتی چلی گئیں، پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارے گدھ کانے کتے پر ٹوٹ پڑے جو نہ جانے کب کا دم توڑ چکا تھا!!

منزل

ہمالہ کی گود میں سرسبز و شاداب بستی میں وہ اپنے گھاس پھوس کے گھر کے آنگن میں کھڑا بار بار آسمان کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ یہ وہی کسان تھا جس کی لہلہاتی فصل کو زمانے کی آندھی نے مسلا تھا۔ کبھی گرم ہواؤں نے اس کے چہرے کو مسخ کیا تھا تو کبھی اپنوں نے ہی اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپا تھا۔ لیکن...... اب باوقار ہستی نے اسے بشارت دی تھی کہ آج اس کی مدد کے لئے ابابیلیں آئیں گی جو اسے ہر غم سے نجات دلا دیں گی۔ وہ خوش تھا کہ اب اس کی فصلیں تباہ نہ ہوں گی۔ اب اس کا گھر نہ اجڑے گا، اب اس کا چہرہ مسخ نہ ہوگا۔ وہ بار بار آسمان کی جانب نظریں اٹھا کر دیکھتا اور ابابیلوں کے آنے کا انتظار کرتا رہا۔ دفعتاً آسمان پر اسے فضا میں کئی سیاہ پرندے اڑتے ہوئے دکھائی دیئے۔ ان میں سے کچھ کا رخ سیدھا اس کے گھر کی طرف تھا۔ وہ سمجھا کہ ابابیلیں اب اس کے ہر غم کا علاج بن کے آئی ہیں۔ لیکن جوں جوں سیاہ پرندے نزدیک آتے جا رہے تھے ان کی شبہات نمایاں ہوتی جا رہی تھیں۔ اس نے دیکھا یہ ابابیلیں نہیں کوئی ابابیل نما سیاہ خونخوار پرندہ ہے۔ لیکن تب تک اس کا گھاس پھوس کا گھر سیاہ پرندوں کی زد میں آ چکا تھا اور انہوں نے اپنے لئے مسکن بنا لیے تھے۔ سیاہ پرندوں نے آن کی آن میں اس کی لہلہاتی فصلیں اجاڑ دی تھیں۔ ان کی پھڑ پھڑاہٹ سے فضا میں دھول سے اس کا چہرہ مسخ ہو چکا تھا۔ وہ بے بسی کے عالم میں بت کی طرح کھڑا اپنی بربادی دیکھتا رہا۔

اس کے ذہن میں اس باوقار ہستی کے وہ الفاظ تازیانے کی طرح بج رہے تھے کہ

آج اس کی مدد کے لئے ابابیلیں آئیں گی جو اسے ہر غم سے نجات دلا دیں گی۔لیکن یہ ابابیلیں تو نہ تھیں۔ابابیلیں فصلیں نہیں تباہ کرتیں۔ابابیلیں گھر نہیں اجاڑتیں.......... پھر ظالم پرندے کو ابابیلوں کا نام کیوں دیا گیا؟

وہ دیر تک اپنے اجڑے ہوئے گھر کو دیکھتا رہا۔جس میں اب ان سیاہ پرندوں نے مسکن بنا لئے تھے۔پھر اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے گرم آنسو ٹپک کر خشک زمین میں جذب ہو گئے اور وہ پلٹ کر چل پڑا۔اندھیرا ہو چکا تھا، ہوا میں خنکی کے باعث رات سرد ہو رہی تھی لیکن وہ چلتا رہا۔نہ اسے خشک ہواؤں کا احساس تھا اور نہ سرد اور سیاہ طویل رات کا...... وہ چلتا رہا۔

سورج کی سنہری کرنیں ہمالہ کی بلند و بالا چوٹیوں پر اپنا نور بکھیر رہی تھیں۔وہ تھک کر بیٹھ چکا تھا، وہ نڈھال ہو چکا تھا کہ اچانک اس کی نگاہ بلندیوں پر اڑتے ہوئے ایک شاہین بچے پر پڑی جو آسمان سے دھرتی کی طرف غوطے لگا رہا تھا۔شاید وہ اپنے شکار کی تلاش میں تھا کہ یکا یک شاہین بچے کے سامنے ایک بہت بڑی چیل اڑتی دکھائی دی۔شاہین بچے نے اپنے شکار کو پہچان لیا تھا۔وہ دنیا سے بے خبر یہ سارا منظر بڑے انہاک سے دیکھ رہا تھا۔ادھر شاہین بچہ فضا میں غوطے لگا رہا تھا، ادھر اس کے تھکے ہوئے اعضا غیر ارادی قوت سے یکجا ہو رہے تھے۔اس کی سانسیں تیز ہو رہی تھیں۔شاہین بچہ چیل پر جھپٹا لیکن چیل اس کے حملہ سے بچ کر نکل گئی۔اگلے ہی لمحہ شاہین بچہ ایک مرتبہ پھر پوری تیزی اور پھرتی کے ساتھ چیل پر جھپٹ چکا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے شاہین بچے نے چیل کو فضا میں چیر پھاڑ ڈالا اور پھر وہ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کر گیا تھا۔اس کی نظریں شاہین بچے کا تعاقب کر رہی تھیں۔وہ ایک لمحہ کے لئے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔اچانک وہ پوری قوت سے اٹھا اور اپنے اجڑے ہوئے گھر کی طرف چل پڑا.......... اس کی آنکھوں میں عقابی چمک نمایاں تھی، شاید اسے اس کی منزل مل گئی تھی۔

وہ آئے گی

وہ میرے گھر کے سامنے ہی رہتی ہے،نکڑ پر اس کا گھر ہے۔ مجھے اعتراف ہے کہ وہ بہت خوبصورت ہے۔ سیاہ دراز گیسو... کالی گھٹا کی مانند... گہری کالی آنکھیں جھیل کی طرح نہیں بلکہ جھیل سے بھی گہری۔ گال گورے نہیں بلکہ سرخ وسفید رنگ یکجا کر دیا جائے تو کیسا رنگ بن جائے گا؟

بس بالکل ویسے۔ بھرے بھرے سے رسیلے ہونٹ جیسے سرخ و سیاہ رنگ ملا دیا جائے ،بس بالکل ویسی ہی رنگ کے۔ موتی کی طرح چمکتے ہوئے دانت جیسے ایک سفید چمکتے موتیوں کی مالا۔ چوڑی پیشانی، بالکل صاف جیسے کوئی لکیریں دیکھ کر تقدیر بتاتا ہو اور اُسے اس کی پیشانی پر کوئی لکیر نہ ملے۔

پورے چاند جیسا گول چہرہ لیکن چودھویں کے چاند جیسا روشن چمکتا ہوا۔

حالانکہ وہ گوری نہیں ہے۔صراحی دار گردن پتلا گورا جسم.........بہت خوبصورت ہے وہ، میں کیسے بیان کروں کہ کیسی ہے وہ.........بس ایک قیامت ہے وہ.........اور ہاں حیا تو ایسی جیسے چھوئی موئی کی ڈالی۔ جیسے ہی کسی کی نظر پڑی اور چھوئی موئی سمٹ گئی۔ وہ میرے گھر کے سامنے ہی رہتی ہے۔ میں ہر روز اسے دیکھتا ہوں اور دیکھتا ہی رہتا ہوں۔ ہر اُس شئے میں جسے لفظ خوبصورت سے نوازا گیا ہے اس میں موجود ہے۔

مجھے اعتراف ہے کہ مجھے اس سے محبت ہے۔ وہ تو ہے ہی محبت کے قابل کہ ہر کوئی اسے محبت کرے۔ میرے جیسے اور نہ جانے کتنے ہی دیوانے ہوں گے۔ ایک میں ہی

کیا اور میری حیثیت۔ہاں تو مجھے اعتراف ہے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں۔اس کی تمنا کرتا ہوں۔اسے حاصل کرنا چاہتا ہوں لیکن کیسے؟ وہ تو اونچے گھر کی شہزادی ہے۔بڑے گھر کی زینت ہے وہ۔اور میں..........میں کیا ہوں؟ایک مفلوک الحال شخص، ناکارہ، آوارہ، نام نہاد معاشرے کا ٹھکرایا ہوا۔کیا ہے، میرے پاس؟ غریبی، بے چینی، غم، سوچ، یا پھر ایک نظریہ۔نظریات میں کیا دیا جا سکتا ہے کسی کو۔غریبی، بے چینی، غم، سوچ یا پھر صرف نظریہ۔

وہ جب بھی سامنے آتی ہے میں اسے دیکھتا ہوں۔یا پھر اسے ہمیشہ دیکھنے کی تاک میں رہتا ہوں۔کبھی کبھی وہ میری طرف دیکھتی ہے۔وہ جب بھی میری طرف دیکھتی ہے تو میرے دل کے خاموش اور ساکت سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہو جاتا ہے۔ٹھیک اسی طرح جس طرح چاند کے گھٹنے اور بڑھنے سے خاموش اور ساکت سمندر میں جوار بھاٹا پیدا ہوتا ہے۔لیکن سمندر کے سینے سے اٹھنے والی جوار بھاٹا کی اونچی اونچی لہریں کبھی چاند کو چھو نہیں سکتیں۔بس میری بھی وہی کیفیت ہے۔خاکی جنت کا یہ چاند میرے دل کے سمندر میں جوار بھاٹا تو پیدا کر سکتا ہے لیکن اس جوار بھاٹا سے اٹھنے والی اونچی اونچی لہریں کبھی اس خاکی چاند کو چھو نہیں سکتیں۔وہ جب بھی میری طرف دیکھتی ہے تو میں اُس کی آنکھوں کے تل میں کسی کو تلاش کرتا ہوں۔کسی کی تصویر تو ہوگی اس کی آنکھوں میں.......... کوئی تو ڈوبا ہوگا اس جھیل میں.......میں کسے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہوں؟ کسی اور کو یا پھر اپنے وجود کو؟ لیکن میں کیسے ہو سکتا ہوں؟

میں اسے کچھ دے بھی تو نہیں سکتا۔وہ تو میری غریبی، میری بے چینی، میرے غم، میری سوچ، میرے نظریات کو اپنا نہیں سکتی۔پھر کون ہو سکتا ہے اس کی آنکھوں میں؟ یقیناً وہ میں نہیں ہوں۔ مجھے تو کسی اور کا انتظار کرنا ہے۔اور وہ آئے گی، اسے آنا ہے.......... اسے آنا ہوگا۔وہ مری غریبی، میرے غم، میری بے چینی.......... میری سوچ اور میرے نظریات سے آگاہ ہے..........وہ مجھے اپنائے گی۔میں اس کی مسرتوں اور لذتوں کا انتظار کر رہا ہوں۔اے وادیو! اے برف پوش کوہسارو! اے مرغزارو! اے آبشارو! اے

لالہ زارو! تم بھی اسی کا انتظار کر رہے ہو؟ پھر تو تم بھی میرے ساتھی ہو کیونکہ میں بھی اسی کا انتظار کر رہا ہوں۔

اے بادِ صبا تو کیوں اس کی آمد کی خبر نہیں دیتی؟ اے نرگس.......... اے سرخ و سفید گلاب.......... اے چنبیلی اور کنول تم کھل کر اس کی آمد کا استقبال کیوں نہیں کرتے؟ کیا تم سب نے سورج مکھی کی فطرت اپنا لی ہے؟ وہ آئے گی پھر تو تم خوب کھلو گے.......... خوب چہکو گے، اپنی مسحور کن خوشبو کا خزانہ بکھیرو گے.......... لیکن ابھی تم کو کیا مجبوری ہے؟.......... کیا مجبوری ہو سکتی ہے تمہاری؟ اسے تو آنا ہے لیکن شاید وہ تم کو معاف نہ کرے.......... لیکن وہ سنگ دل نہیں۔ اس کا دامن تو بہت وسیع ہے.......... شاید تم اپنے آپ کو بھی معاف نہ کر سکو۔

وہ آئے گی۔ وہ کیوں نہیں آئے گی۔ وہ میری بربادیوں کا حاصل ہے۔ وہ میرے نظریات کا حاصل.......... اسے آنا چاہیے۔ اسے آنا ہوگا!

☆☆

ناخدا

وہ آج پھر سمندر کے کنارے کھڑا .... لاٹھی پر جھکا ہوا دور سطح سمندر پر نظریں جمائے کسی کے آنے کا انتظار کر رہا تھا۔اس کا گھر ان ریتیلے اونچے ٹیلوں کے پیچھے تھا جن پر ہر روز جزیرے کے لوگ چڑھ کر ساحل کی طرف ملتجی نگاہوں سے دیکھتے۔

وہ بوڑھا ایک کمسن لڑکا تھا جب وہ ساحل پر ہر روز آ کر حسرت بھری نگاہوں سے سمندر پر دور دور حد نظر تک دیکھا کرتا .... کسی کے آنے کا انتظار کرتا

لیکن کوئی بھی نہ آیا .... لڑکپن سے جوانی .... جوانی سے بڑھاپا .... اور پھر ایک لاٹھی کا سہارا .... لاٹھی جسے دیمک چاٹ رہی تھی اور شاید بوڑھے کو بھی۔ٹیلو کے پیچھے جزیرے میں ہزاروں لوگوں کو بھی یہ دیمک رفتہ رفتہ چاٹ رہی تھی۔

ان کے چہرے زرد ہو چکے تھے .... ان کی آنکھیں پیاسی تھیں .... ان کے جسموں پر چیتھڑوں کے سوا کچھ بھی نہ تھا .... کوئی دیمک تھی جو انہیں چاٹ رہی تھی .... اتنی ظالم کہ بس وہ بے بس تھے .... وہ اس دیمک سے نجات پانا چاہتے تھے۔

جزیرے کے کئی نوجوانوں کو یہ دیمک زمین بوس کر چکی تھی .... اور نہ جانے کتنوں کو اور زمین بوس کرنا چاہتی تھی۔اور پھر اس کا یہ لامحدود سلسلہ .... شاید اسی دیمک سے نجات پانے کی خواہش میں ہر روز ساحل سمندر پر کھڑے کسی ناخدا کا انتظار

کرتے .... لیکن کوئی جہاز .... کوئی کشتی ....
کوئی ناخدا ان دیمک زدہ لوگوں کی نجات کو نہ آیا .... کئی برسوں سے وہ صبح سے شام تک ساحل پر کھڑے انتظار کرتے اور پھر لوٹ جاتے۔ ان میں سے کتنی ہی مایوس نظریں آسمان کی طرف اٹھیں .... کچھ صبر و شکر سے اور کچھ باغیانہ انداز سے .... کہ اے خدائے برتر کیا ہم تیرے بندے نہیں؟

کمزور بوڑھا دیمک زدہ لاٹھی لیکر آہستہ آہستہ ریت پر قدموں کے نشان بناتا ہوا واپس ٹیلوں کی جانب چل پڑا جن پر کل پھر اسے چلنا تھا .... آسمان پر کالے بادل باہم تکرار رہے تھے۔ بوڑھا آج پھر ساحل پر کھڑا تھا۔ لیکن آج اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ چمک جو کئی برسوں سے اس کی آنکھوں سے غائب تھی ....

سمندر کی سطح بالکل ساکت تھی .... سمندر خاموش تھا۔ اور .... یہ علامت سمندر کے اندر ایک خوفناک طوفان .... طوفان جو شاید کسی شکست خوردہ جہاز کو اس گمنام جزیرے کی طرف دھکیل دے جس پر وہ لوگ سوار ہو کر اس دیمک زدہ زندگی سے نجات حاصل کر لیں۔ شاید اسی لئے بوڑھے کی آنکھوں میں چمک پیدا ہو گئی تھی۔ طوفان جو ایک بار پہلے بھی آیا ہوا تھا جب وہ ایک کمسن لڑکا تھا۔ ایک ٹوٹا ہوا جہاز ان کی طرف بڑھ رہا تھا کہ اچانک جنوب سے اٹھنے والی تیز ہوائیں اسے کسی اور جانب لے گئیں تھیں .... آج ایک بار پھر طوفان آنے والا تھا۔ اور شاید کوئی ناخدا بھی .... جو ان لوگوں کو اس دیمک زدہ زندگی سے نجات دلا دے ....

آسمان پر کالے بادلوں کے بیچ بجلی کی کڑک ماحول کو خوفناک بنا رہی تھی اور پھر پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں گرنے لگیں .... بوڑھا ریتلے ٹیلوں پر چڑھ گیا تھا، چند ہی لمحوں میں مسلسل مینہ برسنے لگا جیسے کوئی فرشتہ آسمان پر جشن منا رہا ہو۔ ادھر سمندر کی خاموش، ساکن سطح پر بڑی بڑی لہروں نے جیسے ہمالیہ کو چھونے کا عزم کر رکھا تھا۔

سمندر کی تہہ سے پانی گردش کرتا ہوا آسمان کو چھو رہا تھا، جیسے خضر پورے جلال میں آ گیا ہو۔ ایک بھیانک طوفان آ چکا تھا۔ بوڑھا طوفان کو پتھرائی ہوئی اور ملتجی نظروں سے

دیکھتا رہا، صبح سے شام ہو چلی تھی، اسرافیل کا جشن اور خضر کا جلال اختتام پذیر ہو چکا تھا، سمندر اپنے وجود کو سمیٹ رہا تھا........ سرد اور تیز ہوائیں چل رہی تھیں کہ دفعتاً بوڑھے کی نظریں دور سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہروں پر ایک سیاہ دھبے سے ٹکرائیں .... بوڑھے کی تجربہ کار نظریں اندازہ کر چکی تھیں کہ وہ ایک جہاز کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہو سکتا......... بوڑھا پوری قوت سے اٹھا اور واپس جزیرے کی جانب دوڑ پڑا۔ دیمک زدہ لاٹھی وہیں گری تھی، بوڑھا دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے دوڑتا رہا .... چلا جا رہا تھا......... جہاز آ گیا......... جہاز آ گیا......... ناخدا آ گیا...... اب ہمیں اس دیمک سے نجات مل جائے گی۔ بوڑھے کے اعلان پر جزیرے کے تمام زرد چہرے......... اور ناتواں جسم ساحل کی طرف دوڑ پڑے......... جہاز ساحل پر پہنچ چکا تھا اس کے بادبان پھٹ چکے تھے، جہاز کے پھٹے ہوئے بادبان ناخدا اور طوفان کے درمیان کشمکش کا پتہ دے رہے تھے۔ جہاز کا نوجوان ناخدا عرش پر نمودار ہوا۔ اسے دیکھتے ہی کئی انسانی آوازیں بلند ہوئیں......... خوش......... خوش آمدید اے ناخدا......... ناخدا ایک مضبوط جسم والا نوجوان تھا جس کی آنکھوں میں ایک بحر بیکراں موجزن تھا......... لیکن بوڑھے کی شکن آلود پیشانی پر جھریاں کچھ اور گہری ہو گئی تھیں......... شاید وہ کسی سوچ میں گم تھا۔ اے گمنام جزیرے کے واسیو! میں تم میں سے ہی ایک ہوں......... ناخدا کی باوقار آواز گونجی۔ کیا تم واقعی ہم میں سے ہو؟۔ بوڑھے نے پوچھا۔ ہمارا قافلہ ایک بار پہلے بھی تمہیں اس دیمک سے نجات دلانے آیا تھا پھر ہم ایک طوفان میں گھر گئے تھے لیکن تب ہمارے جہاز کا ناخدا پست ہمت نکلا، اس نے طوفان سے ٹکرانے کے بجائے ہمیں تیز ہواؤں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا اور ہم بہت دور نکل گئے۔ ہم اپنے راستے سے بھٹک گئے، ہم نے اپنا عہد پورا کیا جو ہم سے ہمارے اجداد نے لیا تھا۔ اے لوگو!......... کیا تم ہمارے ساتھ آؤ گے، ایک ایسی دنیا میں جہاں دیمک نہیں ہے......... جہاں چہرے زرد نہیں ہوتے .... جہاں نوجوان زمین بوس نہیں ہوتے۔ آؤ کہ ایک نئی دنیا تمہارا انتظار کر رہی

ہے............. آؤ کہ ہم ساتھ مل کر ایک نئی صبح کا آغاز کریں۔ ہم ایک طوفان کو شکست دے کر ایک درخشندہ مستقبل کی نوید لے کر آئے ہیں۔ جزیرے کے تمام لوگ حیرت سے نوجوان ناخدا کی طرف دیکھ رہے تھے......... تھکی ہوئی شام پر سیاہ اندھیرا اپنی چادر پھیلا رہا تھا اور ناخدا کے ساتھی جہاز پر مشعلیں روشن کر رہے تھے۔ پو پھٹنے تک جزیرے کے تمام لوگ جہاز پر سوار ہو چکے تھے۔ ناخدا کے نوجوان ساتھی جزیرے کے لوگوں کی مدد سے پھٹے ہوئے بادبانوں میں پیوند لگا چکے تھے۔ ناخدا نے ایک بھرپور نظر ان بے بس اور مجبور انسانوں پر ڈالی جنہیں دیمک نے چاٹ لیا تھا...... لیکن اب ان کی آنکھوں میں ایک عجیب چمک تھی...... ایک حوصلہ تھا...... ایک عزم تھا۔

پھر اس نے لنگر اٹھانے کا حکم دے دیا...... جہاز سمندر کی پرسکون سطح پر رینگنے لگا............ نوجوان ناخدا عرشے پر کھڑا دور خلا میں گھور رہا تھا...... شاید وہ منزل کی نشاندہی کر رہا تھا...... !!

☆☆

کینسر وارڈ

اسے تیز تیز بخار ہو رہا تھا۔اس کی کشادہ پیشانی پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے چمک رہے تھے۔آنکھیں مدہوش سی تھیں لیکن چہرے پر جینے کا عزم ہنوز نمایاں تھا۔ایسا لگتا تھا وہ موت کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائے گا۔

آفاق والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی اس کی زندگی میں کینسر جیسے موذی مرض نے دستک دے ڈالی تھی۔اب اٹھائیس برس کا ہو چکا تھا اور اس کے جسم کا کینسر بھی پورے شباب پر تھا۔ڈاکٹروں کی بسیار کوشش کے باوجود اس کا مرض بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔وہ آئی سی یو کے ایک بستر والے شیشے کے کیبن میں اپنی رگوں میں سرائیت کرتے ہوئے اس خون کو تک رہا تھا جو سامنے لٹکی ہوئی بوتل سے اس کی رگوں میں داخل ہو رہا تھا۔

دسمبر کی سرد طویل رات کا پچھلا پہر تھا۔باہر تاروں بھرے شفاف آسمان پر بادل کا آوارہ ٹکڑا چاند کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔سرد چاندنی میں ہلکی ہلکی سرسراتی خنک ہوا چل رہی تھی۔کینسر وارڈ کے دوسرے سرے پر ملاقاتی کمرے میں اس کی ماں آسمان کو تک رہی تھی۔خون بوتل سے ٹپ ٹپ ٹیوب میں گر رہا تھا۔اس نے دھیان ہٹانے کے لئے خود کو ماضی کی یادوں میں گم کرنا چاہا۔دھیرے دھیرے ماضی کے چہرے سے کہرے کے بادل چھٹنے لگے اور چھم چھم کرتی ہوئی ایک شوخ اندام حسینہ کی جوانی ابھرنے لگی۔" ستارہ!" وہ دھیرے سے بڑبڑایا۔ستارہ اس کے کالج کی ساتھی تھی۔ایک بار وہ کلر گارڈن میں ستارہ کا

ہاتھ تھامے مستقبل کے خواب بنتے ہوئے چل رہا تھا تو یکا یک نہ جانے ستارہ کے دل میں کیا سوجھی اور اس سے مخاطب ہوئی ''تم آگے چلو آفاق میں تمہیں چلتے ہوئے دیکھوں گی'' اور یوں جب آفاق نے آگے چلتے چلتے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ یہ دیکھ کر فرطِ جذبات سے جھوم اٹھا کہ ستارہ اس کے قدموں کے نشان جھک کر چوم رہی تھی۔ دونوں نے ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان باندھے لیکن............ جس دن ستارہ کو آفاق کی بیماری کا پتہ چلا جیسے وہ دن ان کے عہد و پیمان کا آخری دن ثابت ہوا۔ ستارہ نے آفاق کے ساتھ سارے تعلق توڑ دیئے اور چپکے سے ایک انجینئر کے ساتھ شادی کر لی۔

وہ ہلکے سے مسکرایا............ خون کا ایک قطرہ اس کے جسم میں اتر رہا تھا۔ یادوں کے گلیشیئر سے ایک اور قطرہ ٹپکا اور یادوں کے آئینے میں ایک اور ہیولیٰ نمودار ہو گیا۔ اسے کیبن کے بند دروازے کے شیشے میں اپنے شریر لڑکپن کی رنگین فلم متحرک نظر آنے لگی۔ پہاڑی ندی کے تیز بہاؤ میں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ''یہ قلعہ ہمارا ہے'' کا دریائی کھیل کھیلتا ہوا خود کو دیکھنے لگا۔

کمسن لڑکوں کی ایک ٹولی بہاؤ میں ایک چٹان کو قلعہ مان کر اس پر قابض ہو جاتی اور دوسری ٹولی کے لڑکے دور سے تیز بہارد کے ساتھ بہتے ہوئے چٹان پر کھڑے لڑکوں کو دھکیلنے کی کوشش کرتے اور ساتھ ہی ایک نعرہ بلند کرتے'' یہ قلعہ ہمارا ہے'' انہیں لڑکوں میں ایک اس کا جگری دوست تھا تبریز۔............ وہ دونوں ہمیشہ ایک ہی ٹولی میں رہ کر چٹان پر سے لڑکوں کو دھکیلتے رہتے۔ کمسنی سے بلوغت اور پھر جوانی کی دہلیز پر دستک دینے تک وہ ہمسفر رہے تھے۔ لوگ ان کی دوستی کی مثال دیا کرتے تھے۔ تبریز اکثر نہایت ہی سنجیدگی سے کہا کرتا: ''دیکھ یار ہم نے لنگوٹی سے دھوتی تک کا سفر اکٹھے طے کیا ہے''

''ہم ایک مثال بن چکے ہیں۔ خدا کرے کہ موت بھی ہم کو جدا نہ کر سکے۔ ہم مریں گے تو بھی ساتھ ساتھ'' لیکن اس جانی دوست کو بھی اس کی بیماری کا راز معلوم ہوا تو اس نے بھی یوں کنی کاٹ لی جیسے کسی انفیکشن سے ڈر گیا ہو............ دوستی آزمائش کا

پل صراط پار نہ کر سکی اور یوں آفاق کی نگاہوں تلے وہ منظر بھی دھندلا پڑ گیا........... ..
کیبن کے باہر اسٹول پر بیٹھی ہوئی نرس نے اپنی کلائی پہ بندھی گھڑی کی طرف دیکھا اور اندر لیٹے مریض پر ایک اچٹتی نظر ڈال کر چل دی۔ شاید اس کی ڈیوٹی کا وقت ختم ہو گیا تھا۔ آفاق نے بڑی حسرت بھری نگاہوں سے خون کی بوتل کی طرف دیکھا................ .. خون کی سرائیت کرنے کا عمل ہنوز جاری تھا۔ اس کے ہونٹ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پھیل گئے۔ وہ خود بڑبڑایا ''وہ کیا ستم ظریفی ہے............. یہ سرخ رنگ مجھے موت کے بے رحم پنجوں سے بچانے کی جدوجہد میں مصروف ہے'' اسے اپنے باپ کا وہ مضبوط فلسفہ یاد آنے لگا جس سے وہ ہمیشہ وابستہ رہا تھا۔ اس کے سر سے باپ کا سایہ کب کا اٹھ چکا تھا لیکن آج بستر مرگ پر بھی اسی نظریہ سے جڑا رہا تھا لیکن اگلے ہی لمحے اس کی کشادہ پیشانی پر گہری شکنیں ابھرنے لگیں۔ اس کے ذہن کے نہاں خانوں میں ایک تیز آندھی چلنے لگی اور اسی آندھی میں یادوں کی البم کے اوراق ایک بار پھر پھڑ پھڑانے لگے۔ بار بار ایک تصویر کا ورق جیسے انکنے لگا۔............. .. وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس تصویر کے متعلق سوچے اور اسی کشمکش میں اس کے چہرے پر پسینے کے ننھے ننھے قطرے ابھرنے لگے۔ تبھی شیشے کے کیبن کے باہر دروازے کے اس پار اس کی ماں اسے دیکھنے کے لئے آ کھڑی ہوئی۔ ماں کو دیکھ کر اس کا چہرہ پر سکون ہو گیا۔ طوفان آہستہ آہستہ سمٹنے لگا تھا۔ آفاق کی آنکھیں نم آلودہ ہو گئیں تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی موت کے بعد دنیا کی اس بھیڑ میں اس کی ماں اکیلی رہ جائے گی۔ وہ کیسے زندگی کے باقی ماندہ دن گزار سکے گی؟

یہ فکر اس کی تمام سوچوں پر غالب آ گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ کچھ یہی کیفیت دروازے کے اس پار کھڑی ماں کی بھی تھی۔ نوجوان بیٹے کو زندگی کے لئے موت کی کشمکش میں مبتلا دیکھ کر ضبط کے سارے باندھ ٹوٹ گئے اور اس کی آنکھوں سے ممتا کے موتی آنسو بن کر گرنے لگے۔ اسے اپنے بیٹے کا بچپن یاد آنے لگا جب آفاق نے پہلی بار اپنی توتلی زبان سے اسے ماں کہا تھا تو اسے ایسا لگا تھا جیسے دنیا بھر کے خزانے اس کے لئے بے معنی ہو کر رہ گئے ہوں۔ ایک بار وہ گھر کے کسی کام میں مصروف تھی

کہ آفاق رینگتا ہوا چولہے میں دہکتے ہوئے انگاروں پر اپنا ہاتھ مار بیٹھا۔آفاق کی دلدوز چیخیں سن کر وہ تڑپ اٹھی تھی۔اور پھر جب قصبے کی ایک بوڑھی کے کہنے پر اس نے اپنے پستانوں سے گرم گرم دودھ کی دھار اس کے زخموں پر ڈالی تھی تو اسے ایسا لگا کہ وہ اپنی تمام ممتا سمیٹ کر اپنے لختِ جگر کے زخم پر انڈیل رہی ہے اور پھر ایک وقت وہ بھی آیا جب وہ آفاق کے کاندھے پر اس کا بستہ ڈال کر اسے اسکول لے جاتی تو اس سے اکثر مخاطب ہو کر کہتی'' میرا منا! آج میں تجھے انگلی پکڑ کے چلنا سکھا رہی ہوں نا .... کل تو بڑا ہو کر ایک جہان کو راستہ دکھانا .... میرے بڑھاپے کا سہارا بننا .... لیکن .... اس کے سارے خواب ریزہ ریزہ ہو رہ گئے تھے۔اس نے پھر ایک بار آفاق کی طرف دیکھا اور آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی باہر چل دی۔آفاق بھی ماں کو جاتے ہوئے دیکھ رہا تھا، شاید وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا .... ماں آنسو بہاتی ہوئی اسپتال کے لان تک پہنچی۔ممتا کا جوار بھاٹا صبر کے باندھ توڑ کر بہنے لگا تھا۔ماں اپنے بیٹے کو گلے سے لگانا چاہتی تھی۔اس کا سر اپنی گود میں رکھنا چاہتی تھی .... دور کسی مسجد کے مینار سے موذن کی آوازِ حق طویل سیاہ رات کو چیرتی ہوئی بلند ہوئی۔ماں نے دونوں ہاتھ دعا کے انداز میں اٹھائے۔آسمان کی وسعتوں کی جانب نگاہیں اٹھا کر رندھی آواز میں گویا ہوئی'' اے دو جہانوں کے رب! میرے لال کو ان دکھوں سے نجات دے۔اس کے بدلے میں مجھے .... !''۔اس کی آواز بھر گئی۔الفاظ گلے میں اٹک کے رہ گئے دفعتاً آسمان پر ایک چمکتا ہوا تارا ٹوٹ کر سیاہ وسعتوں میں گم ہو گیا۔ماں کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کے سینے سے کلیجہ نکال کر زمین پر پٹخ دیا ہو اور وہ خون میں لت پت تڑپ رہا ہو۔وہ خود پر قابو نہ رکھ سکی اور بے تحاشا دوڑتی ہوئی کینسر وارڈ کی جانب لپکی۔بند کیبن کے اس پار خون کی بوتل ٹاٹ کے نیچے گری پڑی تھی اور سارا خون فرش پہ پھیل چکا تھا۔آفاق دروازے کے اس پار خون میں ڈوبا ہوا اوندھے منہ پڑا تھا۔اس نے شاید خون آلود ہاتھ بند دروازے کے شیشے پر بھی مارے تھے۔شاید وہ دروازہ کھولنے کی کوشش کر چکا ہو لیکن .... اس کے چہرے اور آنکھوں پہ چھایا ہوا کرب اس کی

بے بسی کی داستان سنا رہا تھا۔.........اس کی دونوں بانہیں کھلی تھیں..............شاید وہ ماں کے سینے سے لگ کر اس کی گود میں آخری بار اپنا سر رکھنا چاہتا ہو...............ایسا لگتا تھا کہ اس کے ہونٹ ماں ماں کہنے کے لئے کھلے کے کھلے رہ گئے تھے..............!!

کوئی بات نہیں

''خلاصی ہو جائے گی نا۔۔۔؟ آپ کے متعلق کسی نے بڑے اعتماد سے یقین دلایا تھا۔۔۔۔۔۔ہم عزت دار۔۔۔لوگ ہیں اور۔۔۔۔؟

''وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔کوئی بات نہیں۔۔۔۔۔۔''

'' سچ۔۔۔۔۔''

''ہاں ہاں کہہ جو دیا کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔۔''

''تو پھر۔۔۔۔۔۔۔''

'' تین دن دوائی کھانا ہوگی ۔۔۔۔ اس کے بعد میں خود ہی سنبھال لوں گی ۔۔۔۔۔۔ہاں فیس۔۔۔۔۔۔۔؟''

'' میں جانتی ہوں ۔۔۔۔۔۔۔ اس کی کوئی پروانہیں بس خلاصی ہو جائے ۔۔۔۔۔ہم آپ کے احسان مند رہیں گے۔۔۔۔۔''

'' جی ، میں آپ کی بہت خدمت کروں گی ۔۔۔۔۔۔۔۔ پیسے کی پروانہیں ۔۔۔۔۔۔ میں نے کہا نا ہم عزت دار لوگ ہیں صرف ایک بات کا خیال رکھیے گا کہ ۔۔۔۔۔۔''

'' کہ یہ بات صیغہ ءراز میں رہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ غالباً! آپ یہی کہنا چاہ رہی ہیں۔۔۔۔۔۔؟''

''جی۔۔۔۔۔۔جی۔۔۔۔''

''یقین رکھیں ایسا ہی ہوگا۔۔۔۔۔۔''

''جی آپ کا بہت بہت شکریہ، آپ نے میری مشکل حل کردی۔۔۔۔۔۔۔بس اب اس کی جان چھوٹ جائے۔۔۔۔۔''

''کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔''

''شکریہ۔۔۔۔۔۔۔!''

''تین خوراکیں ہیں دوائی کی۔۔۔۔۔۔تین دن صبح نہار منہ کھالے، اول تو مجھے امید ہے کہ اسی سے کام بن جائے گا۔۔۔۔۔۔۔نہ ہو تو تین خوراکیں اور دوں گی۔۔۔۔۔ ویسے آج تک کسی کو دوبارہ دوائی دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔''

ادھیڑ عمر بھاری بھر کم لیکن فیشن ایبل سی صفیہ نے بڑے اعتماد سے اپنے سامنے میز کی دوسری طرف بیٹھی عورت سے کہتے ہوئے اس کے برابر بیٹھی زرد رو مرجھائی ہوئی نوعمر سی لڑکی کی طرف دیکھا۔

لڑکی کا سر احساس ندامت سے جھکا ہوا تھا۔۔۔۔۔۔۔چہرہ زرد تھا، آنکھوں تلے گہرے گہرے سیاہی مائل حلقے تھے ہونٹوں پر پپڑی جمی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔بڑی سی کالی پھولدار چادر میں اس نے اپنا وجود لپیٹ رکھا تھا۔

اسے ساتھ لانے والی عورت بڑی گھبرائی ہوئی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔وہ اس کی ماں تھی یا بہن صفیہ نے یہ نہیں پوچھا تھا۔ نہ ہی اس نے لڑکی کے جرم کی روداد سنی تھی۔۔۔۔۔ اس نے تو کیس دیکھا تھا چند سوال کیے تھے ضرورت مند کی حیثیت کا اندازہ لگایا تھا ۔۔۔۔۔۔اس کی مجبوری کی شدت کو جانچا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔فیس کی حد مقرر کرنے کے لیے وہ صرف اتنا کچھ ہی کیا کرتی تھی۔

وہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ڈاکٹر تھی نہ نرس۔۔۔۔ پیشہ ور دائی بھی نہ تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاں ایک مجرب اور اکیسر نسخہ اس کے ہاتھ آ گیا تھا۔ یہ نسخہ نہیں خزانے کی کنجی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔جو اسے مل گئی تھی۔ آٹھ دس سالوں میں اتنا بڑا تغیر رونما ہو گیا تھا کہ دیکھنے والے ششدر اور حیران

رہ گئے تھے۔

کہاں تو وہ صفیہ جسے خاوند چھوڑ کر دیارِ غیر میں اجنبی ہو کر جا بسا تھا۔ دو بچوں کا بار اٹھانے کے قابل نہ تھی ۔۔۔۔۔۔ اور ایسی گری پڑی نہ تھی کہ لوگوں کے برتن صاف کر کے ہی گزارہ کر لیتی ۔۔۔۔۔۔۔۔ گرداب بلا میں پھنس گئی تھی ۔ عزیزوں ، رشتے داروں نے منہ پھیر لیا تھا کوئی ۔ سگا بھائی بہن تھا نہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ماں باپ مر چکے تھے ۔۔۔۔۔۔ سسرال والوں نے دھتکار دیا تھا ۔۔۔۔۔۔ کسمپرسی کے عالم میں کئی سال گزارنے کے بعد گاؤں کی کسی دائی سے یہ نسخہ ملا تھا ۔۔۔۔۔۔۔۔ چند جڑی بوٹیاں کوٹ چھان کر شہد میں ملا کر گولیاں بنانا ہوتی تھیں ۔۔۔۔۔۔ بس تین گولیوں میں معاملہ پار ہو جاتا۔

شروع شروع میں تو یہ نسخہ اس نے کثرت اولاد سے تنگ آئی عورتوں پر آزمایا نتیجہ غیر معمولی طور پر تسلی بخش رہا ۔ دکھ نہ تکلیف ایک دو ماہ کا حمل آسانی سے گر جاتا ۔۔۔۔۔۔ عورت کی صحت پر بھی کوئی فرق نہیں پڑتا اور کسی قسم کی پیچیدگی بھی نہیں ہوتی ۔

کام بن جاتا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

آہستہ آہستہ اس کی شہرت اور کامیابی کا چرچہ پھیلنے لگا ۔۔۔۔۔۔۔ ضرورت مند خواتین چپکے چپکے آتیں ۔۔۔۔۔۔۔۔ دوائی لے کر کھاتیں اور گلو خلاصی ہو جاتی ۔۔۔۔۔۔۔ پہلے پہلے وہ دس بیس روپے لے کر دوائی بنا دیتی ۔

لیکن جب دوائی اکسیر ثابت ہونے لگی تو ۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس نے ریٹ بڑھا کر دگنا کر دیا ۔

جب گناہ سے نجات کے لیے اس کی طرف رجوع کیا گیا ۔

وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی گھاگ ہوتی گئی ۔۔۔۔۔۔۔۔ نظروں ہی میں آنے والے کی حیثیت کو پرکھ لیتی ۔۔۔۔۔۔۔۔ عزت کے داؤ پر لگے لوگ اس کی منہ مانگی فیس سے بھی زیادہ دینے پر آمادہ ہو جاتے ۔

وہ بھی اصول کی پکی تھی ۔

کسی کا نام و مقام صیغہ، راز میں رکھنے کی حامی بھری تو کیا مجال کسی کو کانوں کان بھی خبر ہو جائے۔۔۔۔۔۔۔اسی وجہ سے اس پر لوگوں کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا۔

یوں۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس نے بے انتہا روپیہ کمایا۔۔۔۔۔۔۔۔وہ صفیہ جو دو وقت کی روٹی کی محتاج تھی، بچوں کا بار اٹھا نہیں سکتی تھی۔۔۔۔۔۔رو رو کر دن رات بے حال ہو جاتی تھی۔

آج بے انتہا مالدار تھی۔

شہر کے ایک فیشن ایبل علاقے میں اس کی خوب صورت سی کوٹھی تھی۔۔۔۔۔۔ ایک بڑی سی کار کی مالک تھی، بیرہ تھا، خانساماں تھا، بیٹا امریکا چلا گیا تھا، بیٹی کالج میں پڑھ رہی تھی، بینک بیلنس روز بروز بڑھ رہا تھا، اونچے طبقے میں شامل تھی باقاعدہ کلب کی ممبر تھی، بڑے بڑے لوگوں سے راہ و رسم تھی۔

بنگلے کا ایک کمرا اس نے اپنے کام کے لیے مخصوص کر رکھا تھا۔۔۔۔۔۔۔یہ کمرا کسی بہت بڑی فرم کے دفتر سے بھی زیادہ آراستہ و پیراستہ تھا۔فرش پھولدار دبیز قالین سے ڈھکا تھا کھڑکیوں پر ریشمی پردے لہراتے تھے۔چمکتی سطح والی میز کے ایک طرف اس کی گھومنے والی گدے دار کرسی ہوتی، دوسری طرف خواتین کے بیٹھنے کے لیے آرام دہ کرسیاں بچھی ہوتیں۔مشورے اور حاجت کے لیے عورتیں اسی کمرے میں آتی تھیں۔

''کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔'' وہ آنے والی ضرورت مند خاتون سے اتنے اعتماد سے کہتی کہ اسے امید کا سنہری روپ پوری تابانی سے نظر آنے لگتا۔۔۔۔۔۔اس کی ہمت بندھ جاتی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور بدنامی کے اندھیروں میں نظر آنے والا بھوت روپوش ہو جاتا۔

یہ جملہ تو اب جیسے صفیہ کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔۔۔۔۔۔۔۔ہر آنے والی عورت کو یہ جملہ مکمل اعتماد کے ساتھ کہتی وہ ضرور سنائی دیتی۔۔۔۔اس کی بیٹی ناظمہ نے جب سے ہوش سنبھالا تھا یہ جملہ سنتی آئی تھی۔

پہلے پہلے تو وہ ان الفاظ کو سمجھ نہ پاتی۔

لیکن

عمر اور شعور کے ساتھ ساتھ ان الفاظ کی معجزہ نمائی کا احساس ہونے لگا۔

ممی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جو چند سال پہلے ناظمہ کی امی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یہ جملہ کسی عورت سے کہتی تو ناظمہ ساری بات سمجھ جاتی۔

مرجھائے ہوئے چہروں والی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اور بدنامی کے خوف سے سپید پڑے چہروں والیاں۔۔۔۔۔۔۔۔اس نے ممی کی صرف تین دن کی دوائی سے مسرور اور شاد ماں ہوتے دیکھی تھیں۔

امی تو کسی سند یافتہ ڈاکٹر سے بھی آگے بڑھ گئی تھیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اب تو اسے بھی یوں لگتا تھا۔

جیسے

''کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔''

''کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔'' کا پراعتماد احساس ناظمہ کے شعور اور لاشعور میں بھی پوری طرح رچ بس گیا تھا۔

شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ سے ملنے جلنے کے سلسلے میں انتہائی بے پرواہو گئی تھی۔

کسی نے چائے کی دعوت دی۔ وہ چل پڑی۔

کسی نے کلب میں مدعو کیا۔ وہ خوشی سے چلی گئی۔

کسی نے دن رات کی قید تو ڑ کر سیر و تفریح کی پیش کش کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔تو اس نے قبول کر لی۔

صفیہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

ناظمہ کی سرگرمیوں سے بے خبر نہ تھی۔۔۔۔۔۔۔۔نئی تہذیب کے جن خطوط پر بیٹی کی تربیت کی تھی اب سرزنش کرنے یا ڈانٹ ڈپٹ سے کام لینے کی مجاز نہ تھی۔

ہاں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔
اکثر وہ اسے پیار سے ٹوک دیا کرتی ۔کبھی کبھی زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے کی بھی کوشش کرتی ۔

لیکن ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

جب بھی وہ نصیحت کرتی ۔

ناظمہ کھلکھلا کر ہنس کر کہتی ۔۔۔۔۔۔۔۔ " ممی کوئی بات ہی نہیں "۔۔۔۔۔۔۔۔۔

صفیہ اسے معصومیت سمجھ کر خود بھی ہنس دیتی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اپنے کاروبار کی سنگینی کا اسے کبھی احساس ہی نہ ہوا تھا ۔

کچی عمر کی ناسمجھ لڑکیاں ۔

مجبوری کی زد میں آئی مجبور بیٹیاں ۔

تنگی حالات سے تنگ آ کر عصمتوں کے سودے کرنے والی لڑکیاں ۔

دباؤ میں آ کر بک جانے والی

اور

جوانی کے جنسی تقاضوں سے مجبور ہو کر گناہ کی وادی میں قدم رکھنے والی نئے فیشن اور نئے دور کی بے راہ رو لڑکیاں سبھی اس کے پاس آ چکی تھیں ۔

اس نے
کبھی

ان کے متعلق سوچا نہیں تھا ۔گناہ کرنے پر روکا ٹوکا نہیں تھا ۔۔۔۔۔۔۔

اس کے لیے تو ان کا آنا سودمند تھا ۔

وہ تو بس اتنا جانتی تھی ۔۔۔۔۔ کہ ان کی ذہنی اذیت اور پریشانی کو دور کر دینا اس کے لیے کوئی بات ہی نہیں تھی ۔ پیسہ بٹورنے کی اندھی دوڑ میں وہ پیش پیش تھی ۔۔۔۔۔۔ دن رات ایک ہی لگن اور ایک ہی دھن تھی ۔

مادہ پرستی نے اسے ان فرائض سے بھی غافل کر دیا تھا۔۔۔۔۔ جو بحیثیت ماں اس پر عائد ہوتے تھے۔

غفلت۔۔۔۔۔۔۔

رنگ لے آئی۔

چند دنوں سے ناظمہ کی بدلی بدلی حالت کو محسوس کر رہی تھی۔۔۔۔۔۔ وہ چپ چپ رہنے لگی تھی۔۔۔۔۔۔ سوچوں میں گم ہر وقت الجھی الجھی اور پریشان سی دکھائی دیتی تھی۔

کئی دنوں کے خاموش مشاہدے کے بعد صفیہ نے ناظمہ سے پوچھ ہی لیا۔

''کیا بات ہے بیٹی۔۔۔۔۔۔۔۔۔ بڑی چپ چپ رہتی ہو۔۔۔۔۔ کسی دوست یا سہیلی سے لڑائی تو نہیں ہو گئی۔۔۔۔۔۔۔۔؟''

ناظمہ کے چہرے پر گھبراہٹ تھی۔۔۔۔۔۔۔ ماں کو جواب دیے بغیر نگاہیں جھکا کر وہ اس کے سامنے سے ہٹ گئی۔ صفیہ کے وجود میں ٹھنڈی سی لہر کپکپا گئی۔۔۔۔۔ یہ گھبراہٹ اور نگاہوں کا ایسا جھکاؤ تو اس نے ہزاروں بار دیکھا تھا۔

صفیہ نے دونوں ہاتھوں میں اپنا چکراتا ہوا سر تھام لیا۔ کئی لمحے بے جان سے بیت گئے۔

پھر۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس نے سر اٹھایا۔

اپنے آپ کو اس بداعتمادی پر برا بھلا کہا۔

اس کی ناظمہ ایسی نہیں ہو سکتی۔۔۔۔۔۔

نہیں ہو سکتی۔

بڑے اعتماد کے ساتھ وہ اٹھی اور ناظمہ کے کمرے کی طرف آئی۔

ناظمہ اپنے کمرے ہی میں تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ بیڈ پر پاؤں لٹکائے بیٹھی گود میں رکھے ہاتھ بے قراری سے مسل رہی تھی۔

صفیہ کو پھر دھچکا سا لگا۔

لیکن ہمت کر کے آگے بڑھی۔۔۔۔۔۔۔۔ بیٹی کے قریب بیٹھتے ہوئے بمشکل ملائمت سے کہا۔۔۔۔۔۔ "کیا بات ہے ۔۔۔۔۔۔۔کیوں پریشان ہو۔۔۔۔۔؟"

ناظمہ نے گھبرا کر ماں کی طرف دیکھا۔

اور پھر جلدی سے سر جھکا لیا۔

صفیہ کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا۔۔۔۔۔۔۔۔اس نے ہاتھ بیٹی کی تھوڑی تلے رکھ کر اس کا چہرہ اونچا کیا۔

زرد

اڑی اڑی رنگت

آنکھوں تلے سیاہی مائل حلقے

پپڑی جمے ہونٹ

وہ بے اختیارانہ چیخی۔۔۔۔۔

"ناظمہ۔۔۔۔!"

"ناظمہ۔۔۔۔!"

گھبرا کر ماں کے بدلتے تیور دیکھتے ہوئے وہ خوفزدہ آواز میں گھگیائی۔ "کوئی بات ہی نہیں۔۔۔۔۔۔۔ممی"

"ناظمہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔!" وہ پورے وجود سے کانپ گئی۔

اس کا بھرپور تھپڑ ناظمہ کے گال پر پڑا۔

ناظمہ ماں کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

☆☆

فنکار

آج اسپتال میں اسمتھ کی آنکھوں پر سے پٹیاں کھولی جانے والی تھیں۔ ڈاکٹر کو یقین تھا کہ اس کی آنکھوں کا آپریشن ضرور کامیاب ہوا ہوگا لیکن اس کی تصدیق تو فقط اسمتھ ہی کرسکتا تھا۔

کچھ عرصہ پہلے کار کے ایک حادثے میں اسمتھ کی جان تو بچ گئی تھی لیکن اس کی آنکھوں کی روشنی چلی گئی تھی۔

چند برس قبل جب اسمتھ اپنے آبائی قصبے سے اس پہاڑی شہر میں آیا تھا تو سب سے پہلے اس کی ملاقات اسکاٹ لینڈ یارڈ پولیس کے لیفٹنٹ ''جیری'' ''سارا'' اور اینڈریو سے ہوئی تھی۔ اینڈریو ایک کروڑ پتی باپ کا بیٹا تھا پر وہ ہر قسم کے نشے کا عادی تھا۔ اسمتھ کے کمرے میں جیری، سارا اور اینڈریو کے علاوہ ڈاکٹر اور نرس بھی موجود تھے۔

جیری کو تعجب تھا کہ آج اسمتھ دنیا کی رنگینیوں اور شادابیوں کو دوبارہ دیکھنے والا تھا۔ لیکن اس پرمسرت موقعہ پر سارا، اسمتھ کے لئے کوئی تحفہ نہ لائی تھی۔ نہ اس کے ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھا۔ اور نہ ہی اس نے بالوں میں سرخ گلاب کا پھول سجایا تھا۔ اسمتھ اکثر سارا کے تراشیدہ بالوں میں سرخ گلاب کا پھول سجاتا اور کہتا'' سارا تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو''

''اسمتھ تم سب سے پہلے کسے دیکھنا پسند کرو گے'' ڈاکٹر نے بڑی شفقت سے اسمتھ سے کہا۔ ''ڈاکٹر میں سب سے پہلے اپنے آپ کو دیکھنا چاہتا ہوں''۔ اسمتھ نے

برجستہ جواب دیا۔

ڈاکٹر کے اشارے پر نرس ایک بڑا آئینہ لے کر اسمتھ کے سامنے پاؤں کی طرف کھڑی ہوگئی۔

سارا اور اینڈریو نرس کیساتھ ہی ہٹ کر کھڑے ہوگئے۔ لیفٹننٹ جیری ان لوگوں سے دور کھڑکی کے پاس کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

''اسمتھ تم ایک لخط ہی آنکھیں نہ کھولنا'' ڈاکٹر نے اسمتھ کی پٹیاں آہستہ آہستہ کھولتے ہوئے اسے ہدایت کی۔

ادھر پٹیوں کی ایک ایک گرہ کھل رہی تھی ادھر اسمتھ کا ذہن ماضی کی غلام گردشوں میں بھٹک رہا تھا۔

اسے اپنے بیتے ہوئے ایام کے واقعات پلکوں کے بند دریچوں میں کسی فلم کی طرح گھومتے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔ اسے اپنا ماضی یاد آ رہا تھا۔ اسمتھ کیمرج کا تعلیم یافتہ تھا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسمتھ نے قلم اور ادب کا سہارا لیا اور اس فن میں وہ کامیاب بھی رہا۔

انگلستان کا ایک سفید فام باشندہ ہوتے ہوئے بھی وہ ہمیشہ سیاہ فام نسل کے حقوق کی بات کرتا۔ اس کے افسانوں میں سیاہ فاموں سے نسلی امتیاز کے خلاف احتجاج ہوتا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوئی بھی انسان اپنے ہی جیسے دوسرے انسان کا حق چھین نہیں سکتا۔ ہر انسان کو اس کا بنیادی حق ملنا ہی چاہیے۔ یہی وجہ تھی کہ انگلستان کا ایک بہت بڑا طبقہ اسے باغی قرار دے چکا تھا۔ کوئی بھی پبلشر اس کے افسانوں کو زیادہ اہمیت نہ دیتا اور وہ ہمیشہ تنگدستی کا شکار رہتا۔

جیری، سارا اور اینڈریو جو خود بھی سفید فام تھے لیکن سیاہ فاموں کے تئیں کافی ہمدردی رکھتے تھے۔ اسمتھ کے افسانوں کی وساطت سے اس کے گہرے دوست بن چکے تھے اور اسمتھ کے خیالات سے بے حد متاثر تھے۔

ایک شام اسمتھ اور سارا حسب معمول وکٹوریہ پارک میں ملے تو سارا نے بنا

کسی ہچکچاہٹ کے اسمتھ سے کہا" میں تم سے شادی کرنا چاہتی ہوں"۔ اسمتھ نے ایک لمحہ سارا کے سپاٹ چہرے کی طرف دیکھا پھر نزدیک سے ہی سرخ گلاب کا ایک بڑا سا پھول توڑ کر اس کے بالوں میں سجایا اور کہا" سارا تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو" اور پھر اگلی ہی شام وہ دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکے تھے۔

سارا ایک کھلے ذہن کی لڑکی تھی۔ وہ اس چھوٹی سی زندگی میں بھرپور لطف اٹھالینا چاہتی تھی۔لیکن اسمتھ کی تنگدستی ہمیشہ اس کے آڑے آ جاتی۔

رفتہ رفتہ ان کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی تھی۔کبھی جیری اور کبھی کروڑ پتی اینڈریو اسمتھ اور سارا کے درمیان مفاہمت کرا دیتے تھے،اب بھی اسمتھ سارا کے بالوں میں سرخ گلاب کا پھول سجاتا اور کہتا تھا" سارا تم دنیا کی حسین ترین لڑکی ہو" شاید وہ سارا کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے محبت کرتا تھا،لیکن سارا کے دل میں اسمتھ کا بناہت اکھڑ چکا تھا۔اب وہ اپنے شوہر کے دوست اینڈریو میں دلچسپی لینے لگی تھی اور اس امر کو اسمتھ کے علاوہ لیفٹننٹ جیری بھی محسوس کر چکا تھا۔لیکن اسمتھ کو یہ یقین تھا کہ سارا اس سے کبھی بھی بے وفائی نہ کرے گی اور لیفٹننٹ جیری کو یہ شک تھا کہ ایک دوست دوستی کی آڑ میں دوسرے دوست کی آبرو پر شب خون نہ مار دے۔اب اسمتھ شام ہوتے ہی ایک لمبا کوٹ اور پینٹ پہن کر سنسان سڑکوں پر نکل جاتا اور رات گئے واپس لوٹتا تو اکثر اینڈریو اس کا منتظر ہوتا.

ایک بار اسمتھ اندھیرا پھیلنے سے قبل ہی واپس گھر لوٹا تو گیٹ کے باہر اسے اینڈریو کی لمبی سفید کار جس پر پیتل کے نمبروں والی پلیٹ لگی ہوئی تھی نظر آئی۔ وہ کار کے نزدیک آ کر اور بھی حیران ہوا کہ اینڈریو بھی کیسا احمق ہے سڑک پر کار کھڑی کر کے چابی اگنیشن میں ہی چھوڑ دی۔ وہ جونہی گھر کے اندر داخل ہوا تو اسے بیڈ روم میں سے کچھ عجیب سی دبی دبی آوازیں سنائی دیں۔ اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں اور کانوں میں جیسے زور زور کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ وہ یہ آوازیں خوب پہچانتا تھا .... فرش نے جیسے اس کے پاؤں جکڑ لئے تھے۔ وہ بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا بیڈ روم کے دروازے تک پہنچا۔لیکن اسے نیم وا دروازہ کھولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس کے بازوؤں کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ اس

نے نیم وا دروازے کی درز سے کمرے کے اندر جھانکا تو اس کی نظریں سامنے کی دیوار پر آویزاں سارا کی قدِ آدم نہایت ہی خوبصورت تصویر پر پڑی۔ جس میں سارا کے بالوں میں سرخ گلاب کا پھول سجا ہوا تھا۔ اور تصویر کے نیچے پلنگ پر سارا کے بالوں میں لگے سرخ گلاب کی پتیاں سفید بے داغ چادر پر خون کے دھبوں کی مانند جا بجا بکھری ہوئی تھیں۔ آج اس کی سارا اسے دھوکہ دے گئی تھی۔ ایک دوست دوستی کی آڑ میں دوسرے دوست کی آبرو پر کامیاب شب خون مار چکا تھا۔

اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا ہی اندھیرا چھا گیا تھا۔ وہ بوجھل قدم اٹھاتا ہوا باہر آ گیا اور اینڈریو کی کار میں بیٹھ کر بے سمت کار دوڑانے لگا تھا۔ ویران سڑک پر نہ جانے کب اور کیسے اسمتھ کی کار سڑک کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے ساتھ ٹکرا گئی تھی۔ اس حادثے میں اس کی جان تو بچ گئی تھی لیکن کار کے سامنے کا شیشہ ریزہ ریزہ ہو کر اس کی آنکھوں میں پڑ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے اس کی آنکھوں سے شیشے کے ٹکڑے تو نکال دیئے تھے لیکن اس کی آنکھوں کی بینائی ختم ہو گئی تھی۔ اب وہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ جیری اسے آنکھوں کے ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا اور معائنے کے بعد ڈاکٹر نے یقین دلایا کہ آپریشن سے اسمتھ کی آنکھیں بالکل ٹھیک ہو سکتی ہیں اور وہ پہلے کی طرح دیکھ سکے گا۔

''اسمتھ اب تم آہستہ آہستہ آنکھیں کھولو اور سامنے آئینے میں دیکھو'' ڈاکٹر نے اسمتھ سے کہا۔

اسمتھ نے دھیرے دھیرے آنکھیں کھولیں اور............ نرس کے ہاتھوں میں آئینے کی طرف دیکھنے لگا۔ لیفٹننٹ جیری اسمتھ کو غور سے دیکھ رہا تھا۔

''ڈاکٹر مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ میں دیکھ نہیں سکتا۔ میں اندھا ہو چکا ہوں۔ اسمتھ چلا رہا تھا۔''

''تمہارا دوست اب کبھی نہیں دیکھ سکے گا'' ڈاکٹر نے اپنے سینے پر صلیب کا نشان بناتے ہوئے اینڈریو سے کہا اور نرس کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔

اینڈریو نے سارا کی طرف دیکھا۔اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہوگئی تھی۔ان کے ہونٹوں پر ایک خفیف سی مسکراہٹ چالاک لیفٹنٹ جیری سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔اسپتال کی طرف سے اسمتھ کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھادیا گیا اور ایک سفید چھڑی کا سہارا لیکر وہ گھر آ گیا۔

جیری اکثر اسمتھ کے پاس آتا اور دنیا بھر کی تازہ ترین صورتِ حال سے اسے آگاہ کرتا۔جیری اندازہ کر چکا تھا کہ اسمتھ پریشانی اور الجھن میں راتوں کو سو نہیں سکتا۔

''جیری بیوی وفادار ہوتی ہے یا دوست؟''ایک دن اسمتھ نے جیری سے پوچھا

جیری سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔وہ اسمتھ کے اس اچانک سوال سے بوکھلا گیا تھا۔

''اسمتھ تمہیں کئی دنوں سے رت جگے برداشت کرنے پڑ رہے ہیں۔میں تمہارے لئے نیند آور گولیاں لے آیا ہوں اور سنو ایک سے زیادہ نہ لینا'' جیری اپنی بوکھلاہٹ کو چھپاتے ہوئے اسے ہدایت دینے لگا اور اسمتھ کے ہاتھ میں چند نیند آور گولیاں تھمادیں۔

اینڈریو اور سارا کے تعلقات اور زیادہ گہرے ہو گئے تھے۔

وہ اینڈریو کے ساتھ پارکوں اور ریستورانوں میں جاتی تھی اور اسمتھ کی موجودگی میں بھی اینڈریو سے لپٹ جاتی تھی۔وہ جانتی تھی کہ اسمتھ اب بھی نہیں دیکھ سکتا کیونکہ وہ ہمیشہ کے لئے اندھا ہو چکا تھا۔کبھی کبھی وہ اسمتھ کے جذبات سے عاری چہرے کو دیکھ کر خوف بھی کھانے لگتے تھے۔آج سارا گہرے نیلے اور ہلکے گلابی جھالردار قمیض میں ملبوس تھی اس پر گہرے میک اپ میں وہ بلا کی حسین نظر آرہی تھی۔بس کمی تھی تو اس کے بالوں میں سرخ گلاب کی۔

''اسمتھ میں اینڈریو کے ساتھ ایک پارٹی میں جارہی ہوں،اور تم تو جانتے ہو اینڈریو کی پارٹیاں صبح ہونے تک چلتی رہتی ہیں۔میں اب صبح ہی لوٹوں گی۔تم میرا انتظار مت کرنا۔میں بڑا دروازہ باہر سے بند کردوں گی'' سارا نے شام کی چائے کی ٹرے میز پر رکھتے ہوئے اسمتھ سے کہا۔اور خود اینڈریو کو بلانے باہر چلی گئی جو شاید باغیچے میں کھڑا تھا۔

''اینڈریو سارا کا خیال رکھنا'' اسمتھ نے اینڈریو سے کہا

''مجھ پر بھروسہ رکھو اسمتھ ''۔ اینڈریو نے چائے کی پیالی اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

جب سارا اور اینڈریو نے چائے کا آخری گھونٹ بھی حلق سے اتار لیا تو اسمتھ نے ان دونوں کو خدا حافظ کہا اور وہ چلے گئے۔ جاتے ہوئے سارا نے گھر کا بڑا دروازہ باہر سے بند کر دیا تھا۔ جب کار کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی تو اسمتھ کے ہونٹوں پر ایک زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔

''خدا حافظ سارا.......... خدا حافظ اینڈریو'' وہ زیر لب بڑبڑایا۔

اینڈریو کی کار جب قومی شاہراہ پر آئی تو وہ ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ خمار سے اس کا سر ڈول رہا تھا۔ اینڈریو نے ایک نظر سامنے ہی بیٹھی سارا پر ڈالی تو وہ کب کی سو چکی تھی۔ اینڈریو کے لئے اب گاڑی سنبھالنا بھی مشکل ہو گیا تھا۔ وہ سامنے سے آتی ہوئی دوسری گاڑیوں کو بڑی مشکل سے پاس کر رہا تھا، اس پر غنودگی طاری ہو چکی تھی۔ ٹریفک پولیس کا پورا ایک دستہ رکنے کا سائرن بجاتا ہوا اس کی کار کے پیچھے آ رہا تھا۔

اینڈریو کو جیسے سائرن کی بہت مدھم سی آواز جیسے بہت دور سے سنائی دے رہی تھی۔ لیکن تب تک اسٹرینگ ویل پر اس کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اور بریک پر پاؤں کا دباؤ ختم ہو چکا تھا۔ پھر اس کی کار سامنے سے آتے ہوئے پٹرول ٹینکر کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ ٹکرا گئی۔ ایک زوردار دھماکہ ہوا، کار سمیت اینڈریو اور سارا کے چیتھڑے اڑ گئے۔ دونوں گاڑیوں کے حصے، پرزے اور انسانی جسموں کے گوشت کے جلنے سے فضا میں گھٹن سی پیدا ہو گئی تھی۔ لیفٹننٹ جیری فائر بریگیڈ کے عملہ کے ساتھ جائے حادثہ پر پہنچ چکا تھا۔

پولیس اور فائر بریگیڈ کے عملہ کو جلے ہوئے ملبے تک پہنچنے میں شاہراہ پر بے ترتیب گاڑیوں اور جام کے باعث نہایت مشکل ہو رہی تھی۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے کی محنت کے بعد جب پولیس اور فائر بریگیڈ کا عملہ آگ پر قابو پانے میں کامیاب ہوا تو جائے حادثہ پر خاکستر گاڑیوں اور جلے ہوئے انسانی پنجروں کے علاوہ کچھ بھی نہ تھا۔

خاکستر ملبے کے ڈھیر میں پولیس کو ایک پیتل کے نمبروں والی پلیٹ ملی تھی جس پر نمبر جھلس کر سیاہ ہو گئے تھے۔ اور شاہراہ پر بکھرے ہوئے کچھ انسانی اعضا بھی ملے تھے جنہیں پولیس نے پوسٹ مارٹم کے لئے بھیج دیا تھا۔ پیتل کے نمبروں والی جھلسی ہوئی نمبر پلیٹ اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ لیفٹنٹ جیری کو پیش کی گئی۔ رپورٹ میں صرف اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ مرنے والوں میں کوئی عورت بھی ہو سکتی ہے۔

لیکن جب جیری کی نظر جھلسی ہوئی پیتل کے نمبروں والی پلیٹ پر پڑی تو وہ چونک اٹھا کیونکہ اسے اینڈریو کی کار کا نمبر معلوم تھا۔ دوسرے دن صبح جب جیری اسمتھ سے ملنے گیا تو گھر کا بڑا دروازہ بند پا کر نہایت متعجب ہوا۔ دروازہ کھول کر وہ راہداری میں سے ہوتا ہوا آگے بڑھا تو خلافِ توقع اسمتھ اسے ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے پاس کھڑا نظر آیا۔ حسبِ معمول اس کی آنکھوں پر سیاہ چشمہ چڑھا ہوا تھا اور دائیں ہاتھ میں سفید چھڑی تھی۔

''اسمتھ ! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟......... سارا کہاں ہے؟''

جیری نے آتے ہی پیشہ وارانہ انداز میں ایک ساتھ کئی سوال کر ڈالے۔

''سارا پچھلی شام اینڈریو کے ساتھ کسی پارٹی میں چلی گئی تھی'' اسمتھ نے نہایت اطمینان کے ساتھ جیری کو جواب دے رہا تھا۔

''اسمتھ کل شام قومی شاہراہ پر ایک کار پٹرول ٹینکر سے ٹکرا گئی'' جیری نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے سنجیدگی سے بولا

''حادثے ہر روز ہی ہوتے ہیں جیری اس میں پریشان ہونے کی کوئی وجہ نہیں'' اسمتھ نے بالکل سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔

''پریشانی کی وجہ ہے اسمتھ !......... پولیس کو مرنے والوں کے کچھ اعضا ملے ہیں جن سے پہچان کرنا بہت دشوار بلکہ ناممکن ہے اور پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں ان میں سے کچھ اعضا کسی عورت کے ہیں اور ایک پیتل کے نمبروں والی جھلسی ہوئی نمبر پلیٹ بھی ملی ہے اور یہ نمبر اینڈریو کی کار کا ہے''۔ جیری ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ گیا تھا۔

''اوخدا!''اسمتھ کے حلق سے ایک گھٹی ہوئی سی آواز نکلی

''نہ تو کار ہمیں ٹیکنیکل معائنہ کرنے کی حالت میں ملی ہے اور نہ ہی مرنے والوں کے جسموں کے مکمل اعضا ہی ملے ہیں جس سے حادثے کی وجہ اور مرنے والوں کی شناخت ہو سکے۔سب کچھ جل کر خاکستر ہو چکا ہے''جیری نے تفصیلات بتاتے ہوئے کہا۔

جیری جب واپس باہر نکل رہا تھا تب اچانک اس کی نظر بیڈ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے سامنے کی دیوار پر پڑی اور وہ چونک گیا کیونکہ وہاں سے سارا کی قد آدم تصویر غائب تھی۔

جیری نے پلٹ کر ڈرائنگ روم کی طرف دیکھا جہاں اسمتھ کھڑکی کے قریب کھڑا اطمینان سے دھوپ سینک رہا تھا۔جیری نے کچھ سوچتے ہوئے بھنویں سکیڑ لیں اور پھر وہ باہر نکل گیا۔

اسمتھ کے پر سکون چہرے پر ایک فاتحانہ مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔پچھلی شام جب سارا چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر اینڈریو کو بلانے باغیچے میں گئی تھی اس وقت اسمتھ نے سارا اور اینڈریو کی چائے میں جیری کی لائی ہوئی نیند آور گولیاں ڈال دی تھیں۔

فنکار اپنے فن کا مظاہرہ کر چکا تھا۔

وقت کی کتاب

''ایک بج گیا استاد! تیل پانی چیک کرلیا؟ سب ٹھیک ٹھاک ہے''
جگتار سنگھ نے لسی کا آخری گھونٹ پیا اور پہلوان کے ہوٹل سے باہر آ گیا۔
اس نے کلائی میں پڑے شہباز قلندر کے نام کے کڑے کو چوما، پھر جسم کو چاروں طرف گھمایا گویا اکھاڑے میں اترنے کی تیاری کر رہا ہو۔اس کے بعد وہ پیڑ کے نیچے کھڑے ہوئے ٹرک کی طرف بڑھ گیا۔کیبن کی کھڑکی کھولی اور اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پہلے لائٹ جلائی پھر اسٹیئرنگ چھوڑ کر دونوں ہاتھ کانوں کو لگائے۔اب وہ ٹرک چلانے کے لئے تیار تھا۔

بیوپاری قیام الدین اور رام بہاری اس کے برابر کی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔کلینر لیاقت نے ٹائروں پر ہاتھ مارا اور بندر کی طرح اچھلتا ہوا چلتے ٹرک کے اوپر آلوؤں کی بوری پر جا بیٹھا پھر اوپر سے آواز لگائی ''سب ٹھیک ہے استاد! جانے دو'' اس کے تھوڑی دیر بعد جگتار کی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی اور رات کے سناٹے میں خاموشی کا سینہ چیر رہی تھی۔وہ جب یہاں آیا تھا تو سب سے پہلے اس نے پلے داری کا کام شروع کیا تھا۔اس کی صحت بہت اچھی تھی۔وہ چھ فٹ کا لمبا تڑنگا جوان تھا۔کچھ عرصہ کے بعد وہ ایک ٹرک پر کلینر ہو گیا تھا پھر کلینر سے ٹرک ڈرائیور اور ڈرائیور سے ٹرک کا مالک بن گیا تھا۔یہ ساری کامیابی اس نے پانچ برس میں حاصل کی تھی۔اپنا ٹرک وہ خود چلاتا تھا۔نصیر آباد میں اس کی اچھی ساکھ تھی۔زیادہ تر بیوپاری اسی کے ٹرک سے مال لے جانا پسند کرتے تھے۔

ٹرک جب چوپلے کی پلیا سے گزرا تو جگتار نے رفتار ایک دم دھیمی کر دی کیونکہ مردان شاہ کی زیارت قریب آ رہی تھی جہاں آ کر ہر ٹرک ڈرائیور ٹرک کی رفتار دھیمی کر کے زیارت کو سلام کرنے کے بعد ہی آگے بڑھتا تھا۔ تمام ٹرک ڈرائیوروں کے دل میں اس زیارت کا بہت احترام تھا اور ڈرائیور برادری کا یہ ایقان تھا کہ مردان شاہ کی زیارت کو سلام کر کے جانے والے ٹرک کو کبھی حادثہ پیش نہیں آ سکتا۔ جگتار سنگھ نے زیارت کے قریب آ کر ایک سیکنڈ کے لئے دونوں ہاتھ اسٹیئرنگ چھوڑ کر جوڑتے ہوئے تھوڑی سی گردن جھکائی اور اگلے ہی پل ٹرک کو اسی اسپیڈ پر چھوڑ دیا۔ اوپر لیاقت آلو کی بوریوں پہ لیٹا اپنا پرانا گیت ''بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارا'' گنگنا رہا تھا۔ ایک موڑ پر ٹرک کو موڑتے وقت جگتار کو بیچ سڑک پر ایک نوجوان کھڑا نظر آیا جو ہاتھ ہلا کر ٹرک کو رکنے کا اشارہ کر رہا تھا۔ جگتار کو خطرے کا احساس ہوا مگر اس کا پیر خود بخود بریک پر چلا گیا اور پھر دباؤ بڑھتا ہی گیا۔ جگتار نے اس نوجوان کے پاس ٹرک روکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ تھوڑی دور ایک موٹر سائیکل کھڑی تھی اور اس موٹر سائیکل کے پاس چادر اوڑھے ایک لڑکی کھڑی تھی۔ ٹرک رکتا دیکھ کر نوجوان ٹرک کی طرف لپکا ''میری موٹر سائیکل خراب ہو گئی ہے۔ ہمیں آگے بسنت پور تک جانا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہو گی'' وہ منت بھرے لہجے میں بولا

''ساتھ میں کون ہے''

''میری بیوی''

''باؤ جی! تسیں معاف کرنا۔ یہ تو رات کا ٹیم ہے۔ اسیں تو زنانیاں دن میں بھی نہیں بٹھاتے'' جگتار نے ٹرک جیسے ہی آگے بڑھانے کی کوشش کی وہ نوجوان کھڑکی سے لپٹ گیا اور گڑگڑا کر مدد کی درخواست کرنے لگا۔ جگتار کا دل پسیج گیا اور اس نے ٹرک روک دیا۔ ''اوئے لیاقت پتر! ڈالا کھول گڈی نوں اوپر چڑھا لے۔ جلدی کر' لیاقت نے بے دلی سے ڈالا کھولا اور اس نوجوان کی مدد سے اسکی موٹر سائیکل اوپر چڑھالی۔ اس کام سے نپٹنے کے بعد وہ نوجوان لڑکی کو لے کر ٹرک کے کیبن کے پاس آ گیا۔ لڑکی ہچکچا رہی تھی مگر جب جگتار نے ٹرک اسٹارٹ کر دیا تو لڑکی اوپر چڑھنے پر مجبور ہو گئی۔ لڑکی نے جیسے ہی اسے سہارا

دیکر ٹرک پر چڑھایا اس کے چہرے سے چادر کھسک گئی اور جگتار پر جیسے بجلی گر پڑی۔ ٹرک پر چڑھنے والی لڑکی کوئی اور نہیں منی تھی۔ وہی منی جو کبھی اسکے خوابوں کی شہزادی تھی۔ نمبر دار سچا سنگھ کی بیٹی۔ جسے پانے کی اس نے تمنا کی تھی۔ اسنے ٹرک روک دی اور کڑک دار آواز میں لڑکے سے پوچھا: ''یہ کون ہے؟ تم کہاں سے آرہے ہو؟ تمہارے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟''

''یہ...... یہ میری بیوی ہے'' لڑکے نے کانپتی ہوئی آواز میں جواب دیا: ''ہم نصیر آباد سے آرہے ہیں'' اچانک جگتار نے اپنی کرپان نکال لی۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا۔

''میں بھی نصیر آباد کا رہنے والا ہوں۔ سچ سچ بتاؤ''

یکا یک منی رو پڑی اور جگتار کے آگے ہاتھ جوڑ کر بولی: ''جگتار ہمیں جانے دے''

''اوئے تو چپ کر، حرام کے پتر چل نیچے اتر''

چاقو دیکھ کر وہ نوجوان پہلے ہی کانپ رہا تھا۔ جگتار کا اشارہ ملتے ہی وہ کھڑکی کھول کر نیچے کود پڑا۔ جگتار کی آواز سن کر لیاقت نے ڈالا کھولا اور اس کی موٹر سائیکل نیچے پھینک دی۔ منی اپنی جگہ سن ہو کر بیٹھی رہی۔ اس کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ جگتار نے اس نوجوان کو ایک بھدی گالی دی اور ٹرک کو بیک کیا۔ ٹرک بیک ہوتا دیکھ کر رام بہاری اور قیام الدین نے کچھ کہنا چاہا لیکن جگتار کے تیور دیکھ کر چپ رہ گئے۔ ٹرک اسی رفتار سے نصیر آباد کی طرف واپس آنے لگا۔ جگتار سنگھ کے خیالات بھی ٹرک کی رفتار سے اس کے دماغ میں گردش کر رہے تھے۔ بہت سے نوجوانوں کی طرح جگتار نے بھی منی کو پانے کا خواب دیکھا تھا مگر منی اور سچا سنگھ دونوں نے ہی نفرت سے اس کا رشتہ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ وہ ان کے قابل نہیں ہے۔ اور جگتار خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا تھا۔ آج وہی منی کسی مجرم کی طرح اس کی بغل میں بیٹھی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ جگتار نے ٹرک کو نصیر آباد کے باہر ہی روک دیا اور لیاقت کو نمبر دار سچا سنگھ کو بلانے بھیج دیا۔

منی نے اسے ایسا کرنے سے بہت منع کیا مگر وہ نہ مانا۔ تھوڑی دیر کے بعد نمبر دار سچا سنگھ لیاقت کے ساتھ آموجود ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ننگی تلوار تھی۔ آتے ہی اس نے منی کی

گردن پر وار کرنا چاہا مگر جگتار نے اسے روک دیا ''نمبر دار عقل کی بات کر'' اس نے ڈپٹ کر کہا ''یہ کیسا پاگل پن ہے۔ سنبھال اپنی عزت اسے گھر لے جا'' سچا سنگھ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے

''پتر تو نے میری عزت بچائی ہے۔ میں تیرا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں نے تیرے ساتھ زیادتی کی تھی۔ مجھے معاف کر دے''

''نمبر دار! کوئی اور گل کر۔ چپ چاپ اندھیرے میں اپنی عزت اپنے گھر لے جا''

''نہیں جگتارے! نہیں! مجھے اور شرمندہ مت کر۔ تو کل برات لے کر آ جا۔ میں منی کا ہاتھ تیرے ہاتھ میں دے دوں گا''

''نہیں نمبر دار! اب یہ نہیں ہو سکتا'' جگتار کی آواز رات کے سناٹے میں لہرائی۔

نمبر دار اسے سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا

''کیوں؟''

''اس لئے کہ کل میں منی کے قابل نہیں تھا آج منی میرے قابل نہیں ہے''

واپسی

''عذیر.........؟''

''کون؟''

''میں.........تمہارا ضمیر.........تمہارے ضمیر کی آواز!''

''ضمیر.........؟ضمیر کی آواز؟ ہاں.........ہاں کیا ہے؟''

''کیا ہے؟ یہ تم مجھ سے پوچھتے ہو؟ اس کا جواب.........؟''

''ہاں! ہاں صحیح ہے، اس کا جواب میں خود جانتا ہوں کہ میں خودکشی کرنے جا رہا ہوں۔ معمول کی دو کاپموز CAMPOSE کے بجائے میں آج ایک درجن کھانے جا رہا ہوں''

''کیوں؟''

''اس کا جواب.........؟''

''ہاں! اس کا جواب میں خود جانتا ہوں کہ تم زندگی سے بیزار ہو گئے ہو، آج اس منزل پر پہنچ گئے ہو کہ.........(شاید) لیکن عذیر تم.........سدا ہی یہ کہتے تھے''

تجربہ کر کے تو نے دیکھ لیا
زندگی کتنا سخت جان ہوں میں

''ٹھیک ہے میں اب بھی وہی کہہ رہا ہوں پر ضمیر.........ہاں! ہاں کہو، رُک کیوں گئے؟''

''تم نے میرا ماضی تو دیکھا ہی ہے، میرے آج تک کے ہر نشیب و فراز.......... کو بھی دیکھنے کے ساتھ پرکھا بھی ہے تو کیا بتا سکتے ہو کہ اس میں کہیں رنج و غم کے بادل کے بجائے مسرت و خوشی کی بھی کوئی کرن تھی؟ شادمانی وفراوانی کی بھی کوئی جھلک تھی؟''

''ہاں.......... یہ تو سچ ہے پر اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ مصیبتوں اور صعوبتوں سے سمجھوتہ کرنے اور ان سے دلیرانہ مقابلہ کرنے کے بجائے بزدلی کے ساتھ ان سے فرار ہو کے زندگی کو ہی.......... بس بس!! سمجھوتہ اور مقابلہ۔ آخر کب تک اور کس کس چیز کا کس کس سے کرتا؟ یاد نہیں؟ بچپن جب مفلسی اور غریبی میں بیتا تو بلکتا ہی رہا بعد ازاں جب نوجوانی کی دہلیز پر پہنچا تو حسرتوں اور خواہشوں کے انبار کو سینے میں دبا کر سسکتا ہی رہا اور جب اسی نوجوانی کا کلائمکس آیا تو جذبات اور احساسات کا ایسا گلا گھونٹا گیا کہ اُف بھی نہ کر سکا۔ کیا یاد نہیں.......... دس برس کی عمر میں کی ہوئی میری سگائی صرف اس لئے توڑی گئی کہ میں غریب تھا؟ مجھے اپنے ہی ایک عزیز کی فرم میں اس لئے کوئی چانس نہیں دیا گیا کہ میرے پاس کوئی ڈگری نہیں تھی (جبکہ میں کام کرنے کی اہلیت کسی بھی ڈگری والے سے زیادہ رکھتا تھا) ہر ایک کی نظر میں اسلئے ذلیل ہوا کہ میرے خیال آئیڈلسٹ اور موڈرن تھے۔ ہر موڑ پر اس لئے چکمہ کھایا کہ میں سیدھا اور سچا تھا؟ کسی امیشن کو اس لئے پورا نہیں کر پایا کہ میرا کوئی سرپرست نہیں تھا۔ میرے اوپر ذمہ داریاں تھیں۔ ماں اور چھوٹے بھائی کی اور تو اور پندرہ برس کے بعد میں مینٹلی افلکٹیڈ (دماغی روگی) بھی ہو گیا تھا جو کہ آج بھی ہوں اور جس کا نتیجہ سامنے ہے۔ کانپور؟ آخرش میں اس منزل پر بھی پہنچا کہ جہاں سے ایک آئیڈیلسٹ کو اپنے آپ سے خود ہی نفرت ہونے لگتی ہے۔ یعنی کہ ہر اس کام کو کیا کہ اگر اس کا راز فاش ہو جائے تو شاید (بلکہ یقیناً) مرا سماج مجھے کسی دوسرے سماج کا ہی آدمی سمجھنے لگے؟

کیا یاد نہیں کہ میں نے بھی کچھ خواب دیکھے تھے؟ کیا اس میں سے کوئی خواب شرمندہ تعبیر ہوا؟ مجھے آج تک میرا جیون ساتھی نہیں ملا (جبکہ میں اب تیس کی گنتی پار کرنے والا ہوں)؟ مجھے میری منزل ملی؟ کوئی ڈگری ملی (جبکہ میں کئی مضامین میں پی ایچ ڈی

کرنے کی سوچا کرتا تھا)

کوئی خواہش پوری ہوئی؟اب تک بھی میں تیس روپے کے بنا لائٹ والے کمرے میں ہی رہ رہا ہوں(جبکہ میں کسی بنگلے کا خواب دیکھا کرتا تھا) کچھ بنا............ سوائے ایک دوسو روپے والے مزدور کے(جبکہ میں ایک بہت بڑا آدمی، ادیب اور ہر دلعزیز بننے کی سوچا کرتا تھا)؟

ہے؟کوئی خواب ہے؟ کیوں خاموش ہوگئے؟ سچ ہے؟ سچائی کڑوی ہوتی ہی ہے

''نہیں نہیں، میں خاموش نہیں ہوگیا ہوں، میں کوئی عام چیز نہیں کہ وہ کسی نہ کسی طریقے سے سمجھوتہ ہی کرلے یا پھر اس راہ ہی کو چھوڑ دے کہ میں تو ایک سچائی ہوں، قدرت کی بنائی ہوئی بہت بڑی چیز کہ جس کا کوئی تقابل ہی نہیں''

''عذیر............ کیا تم نے کبھی سرد راتوں میں فٹ پاتھ پر پڑے سکڑے ہوئے پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس آدمیوں کو دیکھا ہے؟ ہر چوراہے پر، ہاتھ پھیلائے، لولے لنگڑے اور اندھوں کو دیکھا ہے؟ ان آدمیوں کو دیکھا ہے کہ جنہیں صرف چلتی، پھرتی لاش کے علاوہ اور کچھ کہا ہی نہیں جا سکتا؟''

''رات کی سیاہی میں گلی کے کسی نکڑ پر کھڑی پیٹ کی خاطر اپنا'' سب کچھ'' لٹا دینے والی............ کو دیکھا ہے؟''

''بولو! اس کا کچھ جواب ہے؟ میرے دوست! دُکھ اور سُکھ تو گاڑی کے پہیے کی طرح چلتے پھرتے رہتے ہیں۔ یہ زندگی ایک عجیب شئے ہے۔ قدرت کا(شاید) سب سے بڑا عجوبہ اس میں کبھی خوشی، کبھی غم، کبھی چھاؤں، کبھی ساز، کبھی سوز، کبھی شور، کبھی خاموشی، کبھی ہریالی، کبھی ویرانی، کبھی واہ، کبھی آہ!

عذیر! تم تو ماشاءاللہ ابھی جوان ہو، تندرست ہو، وہ آدمی ہی کیا جو کہ وقت سے گھبرا کے پیچھے ہٹ جائے۔ ہر اندھیرے کے بعد اُجالا ہوتا ہے۔ یہی قدرت کا قانون ہے اور یقیناً یہی سچائی بھی ہے۔

خوف سے حقیقت تک

''میڈم! سلمٰی آپ کی کیا لگتی ہیں؟'' تھرڈ ائیر کی چھ سات لڑکیاں ایک گروپ کی صورت میں اُس سے ملنے آئی تھیں، جب وہ کالج کے ایک کونے میں فضا کے ساتھ گھاس پر بیٹھی کیمسٹری کے نوٹس اتار رہی تھی۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد وہ بڑے اشتیاق سے پوچھ رہی تھیں۔

''آپ ان کے ساتھ ہی آتی ہیں نا؟'' طیبہ کے بتانے پر انہوں نے اگلا سوال کیا تھا

''گھر بھی قریب قریب ہیں، پھر تو بہت فرینکلی گپ شپ رہتی ہوگی'' لگ رہا تھا کہ طیبہ سے ملنے سے پہلے انہوں نے خاصا ہوم ورک کیا تھا۔

''آف کورس کزن پہلے سے ہیں جبکہ کالج انہوں نے بعد میں جوائن کیا ہے'' وہ بھی خوش اخلاقی سے مسکراتے ہوئے ان سوالوں کے جواب دے رہی تھی

''سنا ہے کہ وہ روز پارلر سے تیار ہو کر آتی ہیں؟'' ایک لڑکی کے کہنے پر اسے ہنسی آ گئی تھی

''یہ ہوائی کس نے اڑائی ہے بھئی''

''مگر وہ پارٹی والے روز............''

''افوہ............ یار! کبھی کبھار فنکشن میں تو اسٹوڈنٹس بھی پارلر کا چکر لگا لیتی ہیں''

''اچھا ان کی شادی تو نہیں ہوئی مگر کیا ابھی تک منگنی وغیرہ کا کوئی معاملہ بھی نہیں

ہے؟'' وہ بڑے تجسس سے پوچھ رہی تھیں

میڈم سلمٰی حال ہی میں پی ایس سی کر کے آئی تھیں اور کالج جوائن کیا تھا۔ طیبہ ان کی کزن تھی اور ان کے آنے سے طیبہ کو بھی اپنا قد اونچا محسوس ہوتا تھا۔ کالج کی آدھی اسٹوڈنٹس ان کی فینز تھیں اور کیوں نہ ہوتیں وہ تھیں ہی اتنی پیاری اور اسٹائلش۔

مزید کسر ان کی خوب صورت ڈریسنگ سے پوری ہو جاتی تھی۔ گلابی رنگت اور شولڈر کٹ سیاہ بالوں کے ساتھ متناسب سراپا انہیں ہزاروں کے مجمع میں بھی ممتاز کر دیتا تھا۔ ہر جگہ نمایاں ہونے کے باوجود خاندان میں ان کی دوستی کو زیادہ پسند نہیں کیا جاتا تھا مگر سلمٰی کو اس بات کی پرواہ کب تھی۔

ان کے والد آرمی آفیسر تھے۔ مختلف شہروں اور یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی اور اب جموں شفٹ ہونے کے بعد کبھی غور نہیں کیا کہ یہاں کا ماحول کیسا ہے۔ ہاں یہ خیال ضرور تھا کہ ان کے اندر جو خوبیاں ہیں، وہ تیز رفتار زمانے کی دوڑ میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں۔

☆☆

طاہر کی شادی کے لئے سلمٰی نے خصوصی تیاریاں کی تھیں۔ مہندی، بارات اور ولیمے کے شاندار ڈریسز بنوائے پھر اپنے اکلوتے بھائی کی شادی میں خوب ہلا گلا کیا۔ لڈی، بھنگڑا اور ڈانس میں اس کی پرفارمنس دیکھنے والی تھی۔ تمام تقریبات میں وہ مرکزِ نگاہ رہی۔ سہرا بندھائی کی رسم کے بعد بارات چلنے کو تیار تھی۔ میراثیوں نے تھوڑی دیر کیلئے ڈھولک پیٹ کر خوب ہلا گلا کیا۔ سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر تالیاں بجاتے ہوئے سلمٰی نے میراثیوں کی ٹولی پر خوب پیسے لٹائے۔ محفل میں بہت سے لوگوں کی نظریں اس پر مرکوز تھیں اور مووی کیمرے کی آنکھ کم وبیش تمام تر فنکشنز میں اُسے اپنے فوکس میں لئے ہوئے تھی۔

وہاں بہت سی بزرگ خواتین اور لڑکیاں بھی اسے ناگواری سے دیکھ رہی تھیں جو اسٹائلش، سیلولیس ٹائٹ سوٹ میں دوپٹہ گلے میں ڈالے خوب داد دے رہی تھی۔

''سلمٰی ....! ادھر آؤ'' وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی جب ڈرائنگ روم

کے سامنے سے گزرتے ہوئے آپی نے اسے آواز دی تھی۔

''السلام علیکم''اس نے پہلے سے موجود ہستی کو سلام کیا اور آپی کی جانب متوجہ ہوئی''ایکچو لی میں تمہیں مسز نعمان سے ملوانا چاہ رہی تھی۔ یہ اسد کے کولیگ .... میجر نعمان کی مسز ہیں اور دہلی میں ہماری ایک ہی کالونی میں رہائش ہے''

''مسز اسد! یہ کیا میرا تعارف تو کروا دیا اور اتنی پیاری سی گڑیا کا تعارف کروایا ہی نہیں''انہیں غالباً تعارف حاصل کرنے کی زیادہ جلدی تھی، سو آپی کے خاموش ہوتے ہی بول اٹھی تھیں''مسز نعمان! یہ میری چھوٹی سسٹر ہے سلمیٰ۔ یہاں کے کالج میں پڑھاتی ہے''

''ارے بیٹا! ادھر آؤ میرے پاس بیٹھو''وہ رسماً بات چیت کر کے نکلنا چاہتی تھی مگر انہوں نے روک لیا''کون سے کالج میں پڑھاتی ہو؟''اب وہ نہایت دلچسپی سے پوچھ رہی تھیں۔

طاہر کی شادی کے بعد اماں کو رشتے آنے کی امید تو تھی مگر پھر انہوں نے رشتے کرانے والی ماسی کو بھی کہہ دیا تھا اور ساتھ ہی اپنی ڈیمانڈ بھی بتا دی تھی۔ سلمیٰ کے بابا جان کی خواہش تھی کہ ہونے والا داماد آرمی آفیسر ہو مگر اس کا نصیبہ کھلنے کا وسیلہ تب پیدا ہوا جب مسز نعمان نے اگلے ہفتے فون کر کے اپنے اکلوتے بھائی کا رشتہ لانے کی اجازت طلب کی۔ زمیندار خاندان سے تعلق رکھنے والے کیپٹن جاوید اور اس کی فیملی، بابا جان کو بے حد پسند آئی۔تمام تر معاملات کی تحقیق کے بعد ہاں کر دی گئی۔

☆☆

''آؤ جاوید! لاؤنج میں چل کر بیٹھتے ہیں''

ڈنر کے بعد ثمینہ اُسے ٹی وی لاؤنج میں لے آئی تھیں۔آج انہوں نے خاص طور پر مسز نعمان سے کہہ کر جاوید کو بلوالیا تھا کہ اس سے قبل ان کی کبھی تفصیلی ملاقات نہیں ہو سکی تھی۔

''بیٹھو، میں چائے کا کہہ دوں پھر تمہیں ایک اسپیشل چیز دکھاؤں گی''

''اسپیشل چیز؟ چلو دیکھتے ہیں''وہ سوچتا ہوا صوفے پر براجمان ہو گیا تھا۔''ہاں بھئی! آج میں آپ کو طاہر بھائی کی شادی کی موودی دکھاؤں گی۔اس طرح آپ کا سب

سے تعارف بھی ہو جائے گا'' کچن سے واپسی پر وہ اسے بتا رہی تھیں۔

''اور پتا ہے اس مووی میں صرف سلمٰی ہی دکھائی دے گی۔ حتیٰ کہ طاہر اور بھابھی بھی اسے چھیڑتے تھے کہ اس میں دولہا دلہن سے زیادہ تمہیں فوکس کیا گیا ہے'' وہ ہنستے ہوئے جاوید کو بتا رہی تھیں۔

☆☆

منگنی کی تاریخ طے ہونا تھی مگر دوسری طرف سے مکمل خاموشی حیران کن تھی۔ خاموشی کا وقفہ طویل ہوا تو سب گھر والوں کو پریشانی لاحق ہوئی۔ ثمینہ آپی اس مسئلے کو ڈسکس کرنے کے لئے آئی تھیں۔ وہ دانستہ اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گئی تھی۔ سوچتے سوچتے آنکھ لگ گئی اور جب وہ اٹھی تو یاد آیا کہ ماریہ دو دن سے کالج نہیں آ رہی۔ اس کی خیریت دریافت کرنا تھی۔ ''مسز اسد! آئی ایم رئیلی ویری سوری۔ میں بہت شرمندہ ہوں۔ میرا تو حوصلہ ہی نہیں ہو رہا تھا کہ میں آپ لوگوں سے یہ بات کروں'' ریسور میں سے ابھرتی مسز نعمان کی آواز اسے ساکت کر گئی تھی۔

''مگر بات کیا ہے مسز نعمان؟'' آپی بہت حیران ہو کر پوچھ رہی تھیں۔

''آپ کے گھر غالباً جاوید نے کسی فنکشن کی مووی دیکھی تھی، اس کے بعد اس نے شادی سے انکار کر دیا ہے''

''مگر کیوں؟'' ثمینہ آپی ہکا بکا رہ گئیں تھیں ''اس کا کہنا ہے کہ وہ کسی پڑھی لکھی مگر سادہ اور باپردہ گھریلو قسم کی لڑکی سے شادی کرے گا''

نہ جانے آپی اور مسز نعمان میں مزید کیا بات چیت ہوئی۔ سلمٰی نے اتنا سن کر ریسور رکھ دیا تھا اور اب بیٹھی سوچ رہی تھی کہ وہ جن لوازمات کو اپنی شخصیت کا حسن سمجھتی تھی اور ہر جگہ نمایاں رہتی تھی، ان کی بنا پر کوئی اسے ریجیکٹ بھی کر سکتا ہے۔ شاید اس سے قبل جن لوگوں سے اسے واسطہ پڑا تھا، وہ لفظوں سے کھیلتے تھے اور اب حقیقت سے پالا پڑ گیا تھا جس نے غلط اور درست کی تفریق کو اس پر واضح کر دیا تھا۔

☆☆☆

"پڑھنے والے کے لئے بھی یہی موٹا اصول ہے کہ ہر لفظ کو، ہر سطر کو، ہر خیال کو اچھی طرح چباؤ۔ اس لعاب کو جو پڑھنے سے تمہارے دماغ میں پیدا ہوگا۔ اچھی طرح حل کرو کہ جو کچھ تم نے پڑھا ہے، اچھی طرح ہضم ہو سکے۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کے نتائج برے ہونگے، جس کے لئے تم لکھنے والے کو ذمہ دار نہ ٹھہرا سکو گے۔"

سعادت حسن منٹو

"JAB GIDH LAUT AAYE"
(Urdu Short Stories)
by
Shafiq Masood
Compiled by
Liaqat Jafri
Umer Farhat
"شفیق مسعود کے
لکھے کئی افسانے میں نے
دیکھے۔ ہر چند کہ ان میں
جگہ جگہ نو مشقی کے آثار
نظر آتے ہیں لیکن افسانہ
نگار کا دل درد مند بھی
صاف دکھائی دیتا ہے۔
شفیق مسعود کے افسانوں
کی دنیا میں دھندلے رنگ
ہیں، موت اور عزیزوں سے
بچھڑ جانے کے اندوہ ہیں اور
عام انسانوں کے دکھ ہیں۔
یہ افسانے ہمیں معاصر دنیا
کے تلخ حقائق سے روشناس
کرتے ہیں۔"
شمس الرحمٰن فاروقی
۲۵ دسمبر ۲۰۱۰
978-93-86486-61-8
EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com